



نام نیکے رنگاں خدا کی

غزلیاتِ شبلی



شبلی نعمانی

(م: ۱۹۱۴ء)



خدا بخش اور نیک پبلک لائبریری پٹنہ





Shibli's Ghazals

by
Shibli Nomani
(d. 1914)

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna





۷۲۳۶۷

سازمان پخش و توزیع

نام نیک در فنگاں ضائع نمون

غزلیاتِ شبلی

اسکن شد

شبلی نعمانی

(م: ۱۹۱۴ء)

خدا بخش اورینٹل پبلیک لائبریری ٹیٹنہ

سیر صدی تقریبات
چھٹی پیشکش

تقسیم کار :

○ مکتبہ جامعہ لٹریڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

صدر دفتر :

○ مکتبہ جامعہ لٹریڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں :

○ مکتبہ جامعہ لٹریڈ، اردو بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۴

○ مکتبہ جامعہ لٹریڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳

○ مکتبہ جامعہ لٹریڈ، لوئیئر سٹریٹ، مارکیٹ، ٹائیگر کرائے۔ ۲۰۲۰۰۲

انشاعت : ۱۹۹۵ء

قیمت : پچاس روپے

برلن آرٹ پریس (پروپرائیٹرز) مکتبہ جامعہ لٹریڈ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، بلیک ہولی۔

حرفے چند

شبلی بنیادی طور سے شاعر تھے، شاعر نہیں، سچ پچ کے شاعر، خمار چشم ساقی کے بنائے
ہم سے شاعر۔ یہ خمارِ محسوس طور سے انکی فارسی غزلوں میں تو ملتا ہی ہے، لیکن سچ تو یوں ہے کہ وہ
رومانیت جو انھیں رواں دواں اکابر پرستی تک لے گئی (اکابر کی سوانح نگاری) وہ سب بس یہی دل
کا معاملہ تھا۔ دل جب فرح کا ہوتا ہے تو دامنِ دلگی شوق پناہیں تلاش لیتی ہے۔

شبلی کی فارسی شاعری جو مختلف محبوبوں میں بکھری ہوئی، ایک بار کلیات شبلی میں قصیدوں
وغیرہ کے ساتھ مل کے بھی شائع ہوئی ہے، ہمارے محترم اولاد احمد صاحب نے قوجہ دلائی کہ اتنا خوبصورت
شاعریت سے چھپا پڑا ہو بس اس پاداش میں کہ وہ الفادوق اور سیدوت النبی کا بھی مصنف
ہے، اور صرف اس جرم میں کہ بارشیں تھا اور مولانا علامہ کا ایک الگ ایچ بنا چکا تھا حالانکہ اس کے
تخلیق ذہن کا حسین ترین حصہ فارسی شاعری میں چھپا پڑا ہے!

ہم نے مناسب سمجھا کہ سرسید صدی تقریبات میں سرسید کے نورتنوں کو بھی یاد کیا جائے۔
خاص طور سے ان کی ان چیزوں کو جو غلط مفروضوں کی بنا پر چھپکے رکھی باقی ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے
کہ ایسی چیزوں سے ان کی شخصیت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔

شبلی کی غزلوں پر ہم کیا لکھیں، اکرام (شیخ محمد اکرام) نے اتنا اچھا لکھ دیا ہے کہ کوئی گنجائش ہی
نہیں چھوڑی۔ چنانچہ میکا گار شبلی (۱۹۷۱ء) میں شامل شبلی کی فارسی شاعری پر جو باب ہے، اس میں
غزلوں کے بارے میں ان کے تبصرہ کو پیشگفتار بنایا جا رہا ہے غزلوں کی باری میں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ

چار

کبھی مہدائیر میں ہندستان میں فارسی زبان کے ان اہم ترین غزلگوؤں کی بات چہڑے گی، جو ایران میں بھی لطف و انبساط کے ساتھ پڑھے جا سکیں اور وہی مسرت و بصیرت بخش سکیں تو اس اثر و تشلیث غالب، بشلی اور اقبال کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔

ایک بات یہ کہ دینی ضروری ہے کہ غزلوں کے علاوہ بشلی نے تصدیق بھی لکھے، مثنویاں بھی قسطی بھی، رباعیاں بھی۔ لیکن یہ سب کچھ دیوان کی ہیئت مکمل کرنے کے لیے، کچھ ضرورتِ وقت کے لیے، کچھ بہ پاسِ خاطرِ دوستان، کچھ یوں، کچھ یوں — مگر دل کی باتیں، دل کی زبان میں انہوں نے صرف غزل میں کہی ہیں، جس میں انکی شاعری کا نقطہء عروج مل جاتا ہے۔ بلکہ صاف صاف یہ کیوں کہیں گزشتہ نے فارسی میں شاعری اگر کی ہے تو بس غزلوں ہی میں۔ اس لیے ہم نے ان کے کلام کے دیگر اہنفا کو نظر انداز کر کے صرف غزلوں ہی کو شائع کرنا مناسب سمجھا۔

— (عرب)

اولاد صاحب مکرم (ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی) کی نذر

فہرست

فہرست میں پہچان کے لیے ہر غزل کے پہلے شعر کا (غزوی نہیں کہ مطلع ہو) دوسرا شعر دیا گیا ہے
الفبائی ترتیب ردیف کا اعتبار ہے۔

ردیف ب

۹۱ کزنسیم مہج گرد و شعلہ چوں مرغا کباب

ردیف ت

۴۸ کہ پردہ بر رخ این کاری تو ان آداخت
۷۷ کہ ہم از نام و ہم نشان برخاست
۱۰۰ یافتہ بہ ترکناز برخاست
۱۰۱ نخت دل باز آرایش مرغاں برخاست
۱۰۲ چاک با آنکہ زجیب ست بدماں درخاست
۴۱ نہاد کہ تاب جلوہ روی منم نہداشت
۱۰۱ دقتی ہر اگر اے دل شب با ہم سحرے داشت
۶۰ نہ ہمیں بوسہ کہ دشنام خوش است
۷۲ امید بوسہ اگر ہست ہم بہ پیغام است
۷۳ یعنی کہ از طریق ریا بر نمشتہ است
۸۷ ایں ملکوت حسن بلاخیز نہ بودہ است
۱۰۲ ایں قدر ہست کہ بت نانہ دناویر تراست

ردیف الف

۲۹ طراز مسند جمید و فر تاج خسرو را
۲۰ جلوہ یادت دہ از خویش فراموشی را
۳۹ کہ از یک جلوہ گلشن می تواند کرد زنداں را
۴۱ دیدی تظاول خم زلف دراز را
۵۱ بہ غارت برد باز آں چشم پر فن کاروازی را
۶۶ ساقی بہ جام ریخت، مخم نارسیدہ را
۷۵ سوز عیاں نگشتہ و عشق نبودہ را
۹۱ کہ گلہے شاہ بنواز دگدا را
۹۹ ابروے تو یکجاہ فرو ریخت شکن را
۱۰۰ کہ من یک قدو بالا چیدہ ام ذوق تماشا را
۱۰۰ بپرس از تشنہ کامان سستم ذوق عما بش را
۹۹ صدرہ آں عریذہ جو داد بکن باز مرا
۴۲ حد کعبہ نیز یاد بتاں کردہ ایم ما
۴۵ از ردی شوق، پلے ز سر می کنیم ما
۹۹ خنما مگر نبود خط سر نوشت ما

- ۸۹ میں قدر ہم، اگر مقل بود، بس باشد
 ۴۶ یکبارہ اساس خرد دہوش بر افتاد
 ۹۴ کہ فلان می زد و نچو شد و سرشار افتاد
 ۱۰۲ ہجو تر کے کہ بنا کہ زکس بر خیزد
 ۳۲ غلطی در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود
 ۳۶ ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو باز بود
 ۳۸ ایں جان ست کہ بردادی ایں زدہ بود
 ۴۲ در بر من اول آن کہ رسید آفتاب بود
 ۴۴ رخسار در گنبد گردون گرداں کردہ بود
 ۴۵ سر جوش بادہ کین روزگار بود
 ۵۲ گفتگو از خم و مینا و سبو خواهد بود
 ۶۱ ہر شیدہ اش بلائی دل درد مند بود
 ۱۰۳ بیہودہ مرا عریبہ با چرخ حروں بود
 ۴۳ خوش بود آن کہ راز محبت عیاں نبود
 ۴۴ جدرے کہ کردہ است بہ طور جفا نبود
 ۶۸ بمبئی مگر ہمہ بر خویش ننازد چکند
 ۱۰۳ دارم از داغ تو در سینہ گلستاں چند
 ۱۰۳ ہر طرف ناہمائی میں پیکہ
 ۹۱ تارفتہ رفتہ کار بہ بند قار رسید
 ۳۴ یکدم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
 ۴۵ لیک چوں شد، نتوان گفت کہ سزا نشود
 ۲۴ ہر حدیثے کہ با کرد ہم از مای کرد
 ۶۳ کہ مگر عشق را بے خان و مال کرد

- ۵۰ انصاف کے باش کرد و وعدہ دیداری هست
 ۸۸ کہیں سحر نیست، فروغ رخ زیبای تو هست
 ۹۰ شکیب و مہر چو کیم کہ نیستم، یا هست
 ۱۰۱ فوہت داوری از غمرہ پنهانی هست
 ۲۸ ایں بادہ پختہ نیز نشد گرچہ خام نیست
 ۸۰ در وصل نیز عاشق غمدیدہ شاد نیست
 ۸۸ حاشا کہ بہ نغما زہ ذوق نظری نیست
 ۲۹ ایکہ گفتی رقص بسل، اضطرابی بیش نیست
 ۲۹ مے خورد گرسن ز عذاب و ثواب چیست
 ۳۴ پارہ از دل و لحنے تزجگری بایست
 ۴۲ عیسیٰ آخر علاج دل بیمار گذشت
 ۴۹ بارے کہ بر تن ما بود، برگرفت
 ۲۵ مگر ایں شیوہ از اں چشم نموں ساز گرفت

سر دیف ۵

- ۴۴ ہنگامہ ستہ ہی ز ایدہ بسر آمد
 ۴۰ ساغر از کف بہند میکہ بردوش آید
 ۵۹ کز سفر بار غر کردہ مای آید
 ۶۳ کہ نیست ز درم و آں بت بہ زرنمی آید
 ۸۹ ما ہمینیم کہ ہستیم و ہمیں ی باید
 ۵۲ تنگ نظرے چوں را بوی از ک نیزی باشد
 ۴۸ بوسہ لعل شکیں باشد
 ۸۴ نامہ را کہ گراں مایہ ترا ز جاں باشد

- ۶۹ آنچه آخر کردم از آغازی بایست کرد
 ۷۰ این قیاس از نرگس بیماری بایست کرد
 ۱۰۴ با غمزه بیباک ندانم چه توان کرد
 ۷۱ گویانسیم دوست به خاکم گذر نکرد
 ۷۵ بسی نماند که این حرف داستان گردد
 ۸۱ دیں جز انسان نباشد که وفایز کند
 ۷۴ دیوانه است عقل ز شورش برون کند
 ۷۹ بعد عمر که در اندیشه هر کار بماند
 ۷۸ یعنی گل مراد مرارنگ و بونماند
 ۷۱ که مرا جز به زو و باده سر و کار نماند
 ۱۰۴ هستم خزان خویشتن و هم بهار خویش
 ۱۰۴ من سر کنم فسان چونان زبان شمع

س ر د ی ف ش

س ر د ی ف خ

س ر د ی ف م

- ۶۷ با مؤ و ن باده ام تا باده ام
 ۷۹ اندیشه غایبست، من نیز به سر دارم
 ۵۱ تانز آئینه روی تو مقابل دارم
 ۷۱ یاد آن روزی که من با خود جلفی داشتم
 ۹۱ از دهن با چشم پر نمی رویم
 ۲۰ شرم بادم که نوا به پریشان زده ام
 ۱۰۴ شلی نگر که تا بچه عنقا فرخستم
 ۶۲ محبت را همین یک دام بر من بود ادا کردم
 ۶۵ کسب این فن همه نمان نرگس قاتل کردم
 ۷۳ آنچه چشم کافرش فرموده است آن کرد ادا کردم
 ۸۱ ما ابتداء کار را انجام کرده ایم
 ۳۳ میل بالاله رخاں گر نه کنم تا چه کنم
 ۱۰۴ در بغاوت برد آن نرگس خاں چه کنم
 ۹۳ بخود بزیر سایه طوبی گریستم
 ۸۲ این قدر دانه که زاهد آنچه هست آن نیستم
 ۵۲ که شمع نیکه دانی برد از من عقل و ایمان هم

س ر د ی ف ن

- ۶۱ پیام بنده به آن خاک آستان برسان
 ۹۲ صد آب برد از مرثه ما گریستن
 ۱۰۵ با آنکه داشت از همه اعضا گریستن
 ۱۰۵ کز دل و دیده ام یکو نیست با اختیار من
 ۹۲ ناهه روزگار شلی نام آدم
 ۲۹ زین پس با قدح و باده دینا باشم
 ۶۷ مالی اعلست آن است که نادان باشم
 ۹۳ چند چون زلف تو آشفته و در هم باشم
 ۵۰ یعنی که مست باده منهور بوده ایم

سادیف ی

یکڑہ از جلوہ بیابام کہ آیم بر جلے ۱۰۵
چناں بیباک نوحں ریزد کہ جلا دست پنداری ۳۲
ہنوز آں چشم پر فن بر سر کارست پنداری ۳۴
یار بمانیز کر داشتے ۱۰۵

سادیف و

سنبل تربتہ گیسوے تو

۹۲

سادیف ہ

باز بر قتل کہ دامن بہ کمر برزدہ

۴۷



کچھ شبلی کی غزلوں کے بارے میں

ستیخ محمد اکرام

محبی عابدہ رضا صاحبہ کی مدد سے

(۱۰)

”فغان کہ از خرد و عشق کردہ ایم قبول
دو کار خانہ کہ بایک دگر نئے گرد دہا“

نزد وہ کی تجھ جٹ اور شاعری؟ ساتھ ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں، لیکن بہر حال چارہ بھی
نہیں۔ نندہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی۔ کس کو چھوڑوں؟ (شبلی آ)

علامہ شبلی کی تعلیم کے سلسلے میں ہم نے ان کے مشفق استاد مولانا محمد قاری قاریا کوئی کی کوئی
طبیعت کا ذکر کیا تھا اور اس کے متعلق ان کے بعض فارسی اشعار نقل کیے تھے۔ یہی رنگ طبیعت
نامور شاگرد کا تھا۔ اپنے زمانہ شباب میں بھی وہ بیک وقت مذہب خفیعہ کے ایک متشدد پرست اور اعظم گڑھ
کے رئیس المتفکرین تھے۔ مولانا اس زمانے میں تاملین صلاۃ کو نماز نہ پڑھتے پر دو دو گھنٹے تک پڑھتے تھے اور

ساتھ ہی ساتھ شہر میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان کے میں مجلس بننے اور گرم گرم عاشقانہ اشعار لکھتے وہ علی گڑھ گئے تو ان کی قسرت کی یہ تنویر کسی قدر دب گئی، لیکن ایک فطری شاعر کو قومی مصلحت کی زنجیریں کب تک بکڑ سکتی ہیں۔ انھیں اس قصا سے ذرا بھی نکلنے کا موقع ملتا تو پورا اُنے مشاغل پھر تازہ ہو جاتے۔ انھوں نے روم و مصر و شام کے سفر پر جو نظم لکھی ہے اس میں اپنی اوقلمونی طبیعت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

گاہ در زبم نغیبان گراں مایر رسید	گاہ در حلقہ مردلان نظر باز آمد
گاہ با سادہ دلاں شیوہ تقلید گرفت	گاہ بادینہ دلاں پردہ درواز آمد
گاہ در بیت مقدس بہ مفتی شہر	از رخ شاہدین پردہ براندا آمد
گاہ در قاہرہ نہاں بہ قاضی ہوس	بہ قصیر شد و در سلوہ گناز آمد

آخری شعر میں مولانا نے یہاں ”قصیر اور جلوہ گہ ناز“ تک پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اس دل چسپی کی کئی شہادتیں ملتی ہیں۔ یاد ایام میں مولوی عبدالرزاق کانپوری (مصنف البرکۃ) ان کی نسبت لکھتے ہیں: ”تاریخی ذوق اور علمی تحقیقات کی بنا پر مولانا ہر قسم کے میلوں اور تفریحات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں کانپور کی رام لپلا کی تفصیل لکھی ہے جس کا تماشا مولانا نے لکھنؤ سے اُگدیکھا اور جس کے مناظر اور دل چسپیوں کے متعلق انھوں نے بڑے پُر لطیف طریقے سے ”دربار لڑنے“ تبصرو کیا۔

مولوی عبدالرزاق کانپوری نے میلوں اور اس طرح کی دوسری تفریحات میں علامہ کی شرکت کو ان کے تاریخی ذوق کا کرشمہ قرار دیا ہے۔ اور ایک حد تک یہ درست ہوگا، لیکن شاید ان دل چسپیوں میں مولانا کے خاندانی اثرات اور ابتدائی ماحول کو بھی دخل ہوگا۔ علامہ نے قدیم تعلیم میں امتیاز حاصل کیا اور بعض قومی مصلحتوں کی بنا پر وہ مذہبی علما کی ایک تحریک کے راہنما ہو گئے۔ ان تعلقات کی بنا پر انھوں نے اپنے اوپر کئی پابندیاں گوارا کر لیں، لیکن مذہبی علما کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ ایک رئیس زادے تھے۔ ان کے والد اپنے منافع کے متنازع وکیل اور زمیندار تھے۔ ایک بھائی بیرسٹر اور دوسرا

کامیاب وکیل تھا اس طبقہ کی جو دل چسپیاں ہوتی ہیں علامہ ان سے آزاد نہ تھے احتیاط اور صحت کا معاملہ جدا کا نہ ہے۔ لیکن علامہ اس طبقے کی عام بے فکر تقریروں کو برا نہ سمجھتے تھے بلکہ شاید طبیعت کی تازگی کے لیے انھیں مفید خیال کرتے تھے۔ اپنے بے تکلف اور رازدار دوستوں سے ان کے متعلق پردہ نہ کرتے اور رائے عامہ کو برا فروختہ کیے بغیر اپنے تقریر کی ادنیٰ ذوق کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔

یادِ پیام میں انھوں نے مولانا کی نسبت ایک طویل اور پُر از معلومات مقالہ لکھا ہے۔ اس کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں:-

”جس زمانے میں مولانا کا بدوق سے ایک پائلٹ متاثر ہو چکا تھا لکھنؤ میں قیام تھا اور تنہائی سے پریشان رہتے تھے۔ ایک دن میں لکھنؤ گیا امیں ہر اقدار کو کانپور سے لکھنؤ جایا کرتا تھا کینہ میں مدد کا اہمیری بھی سب تھا (تو فرمایا کہ میں لکھنؤ میں بھی ایک نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دریافت کیا کہ شاطیہ نکاح کیا ہیں؟ ہر شاد ہو کر منسوبہ شریف خاندان ہو اور شرمسار سے زائد نہ ہو حسن و جمال کے علاوہ شاعری اور وسیعیت میں بھی دخل ہو اور خاص شرط یہ ہے کہ اس کے رشتے داروں کا دائرہ وسیع نہ ہو۔ محض والدین ہوں تو شاطیہ نہیں ہے اور نکاح سے قبل میں اس کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ چنانچہ اسی مقامات کا بعض ایسا نے پتہ لگا دیا ہے۔

میں نے مذاقاً کہا کہ تمہارے اقبال گر چکا ہے۔ ڈاڑھی تل چڑھی ہو گئی ہے۔ دوستوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آپ چلتے ہیں۔ لہذا کوئی حسین اور جوان عورت آپ کو پسند نہیں کرے گی۔ یہ سنتے ہی خفا ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے فوراً تقریر کا رخ پلٹ دیا اور مولانا کو وہ طریقے بتائے جس پر عمل کرنے سے نکاح ہو سکتا تھا۔ تو خوش ہو گئے اور فرمایا ”معلوم ہوتا ہے کہ برسوں مشاطہ گرن کی ہے۔“ جب میں دوسرے ہفتے میں ملا تو فرمایا کہ بھائی صاحب آپ سچ کہتے تھے کبھی کی، رنگ مزاج خواتین سے یہ اس سنگم پہنچا ہے اور میں سچ کہ اس نکاح میں میرے ساتھ فریب کیا جائے۔“

منقولہ بالا سطور سے مولانا شبلی کے رنگ طبیعت اور اس زمانے کے خیالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن شاید شبلی کے سوانح نگار کے لیے ان کی اصل اہمیت اس لیے ہے کہ اس اندراج کی روشنی میں عطیہ بیگم والے خطوط کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ مولانا کے اس کے نام کے سارے خط اس زمانے کے ہیں۔ جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ہمارا قیاس ہے کہ مولانا ایک زمانے تک یہ خواب دیکھتے رہے کہ نکاح ثالث کے متعلق ان کے جو ارمان تھے۔ شاید وہ بیبی کی آزادانہ فضا میں پورے ہو جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ فریقین کی عمروں میں جو تفاوت تھا۔ اس کے لحاظ سے (اور بالخصوص حادثہ رگنند پاکے بعد) یہ خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن لکھنؤ والے رشتے میں بھی عمروں کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ اور اس تجویز کے وقت بھی مولانا کا یہ ایک پاؤں مناج ہو چکا تھا!

یہ بھی صحیح ہے کہ مندرجہ بالا قیاس کی واضح شہادت کوئی نہیں۔ (اور ایسے نادرگ امور میں نیم رسمی تعلقات کی صورت میں واضح تحریری شواہد ڈھونڈنا حاصل ہے)۔ لیکن مولوی عبدالرزاق کے بیان کی روشنی میں یہ قیاس بے جا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے علاوہ فوقانی کی ہمیشہ کے نام ایک خط میں مولانا نے جس طرح تفاوت عمری کا ذکر کرنے کی کوشش کی اور ان کے والد کو "عمادہ حریت سے" بنا چھپا ثابت کیا (تفصیل آگے آئے گی) وہ خود توجہ طلب ہے۔ ان حالات میں تزویج منصوبوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور شاید انھیں نظر انداز کرنے سے خطوط شبلی کے معاملے میں مولانا شبلی کے ساتھ انصاف مشکل ہو۔

مولوی عبدالرزاق نے مولانا کی تجویز عقد پر "مذاقاً" تبصرہ کیا تھا۔ انھیں غالباً یہ معلوم نہ تھا کہ بے پناہ دماغی محنت و یا بیس اور افکار و کشمکش دروں نے اس فانی معلم، مہتمم کی صحت اعصاب اور طبیعت کا یہ حال کر رکھا تھا کہ ان کے معالج نے ۱۹۰۰ء میں بھی انھیں ایک رفیقہ حیات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو حیات شبلی ص ۳۴۸)

شعر العجم کی کیفیت آفرینی | اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان دنوں مولانا شعر العجم تالیف کر رہے تھے۔ ہر حرف فارسی شعر کے تذکرے اور آوازیں پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان کا دل و دماغ فارسی شاعری کی محظوظ اور کیف آور تہاؤں میں بسر ہوتا تھا۔

ایسی حالت میں طبیعت پر ایک شاعرانہ رنگ غالب آ جانا قدرتی تھا۔ بقول مولانا عبد السلام "وَن رات کا یہ مشغلہ خود ذوق شاعری کے لیے تازیانہ کا کام دیتا تھا۔ اس کے بعد جب مولانا نے ممبئی کا سالانہ سفر شروع کیا تو وہاں کی دلاویز آب و ہوا، قلموں مناظر، فراوانی حسن و جمال اور صحبت ملنے لگیں نے اس شراب کو بالکل دوا آتشہ کر دیا، چنانچہ دستہ لگے اور گئے گل کی غزلیں ان سفروں کا دواؤں میں۔ مولانا کے دل و دماغ پر ان دنوں جو شاعرانہ کیفیت مستی چھائی ہوئی تھی، اس کا ظہور صرف شاعری اور لکے گل کی ان غزلوں میں نہیں ہوا، جن کے متعلق مولانا حالی نے شاعر کو لکھا: "مغز میں کا ہے کہیں شراب دوا آتشہ ہیں جس کے نشہ میں خمارِ شمع سا قی ملا ہوا ہے" اور "ہمانا قال رازِ نگِ حال دادہ اید یا خود حال را در لباسِ قال جلوہ گر ساختہ اید"۔ بلکہ خطوطِ شبلی میں بھی اس کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ خطوطِ نثر میں ہیں لیکن شعرِ محکم کی کیفیت آفرینی ان میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ زیادہ تر اس زمانے میں لکھے گئے جب مولانا کی شاعرانہ طبیعت جو "پر آئی ہوئی تھی" یہ خطوطِ بڑی حد تک شعری صحیفے ہیں۔ ان کی اصل دل چسپی ادبی ہے۔ علمی یا تاریخی نہیں۔ ان کی تحریر میں مولانا کے اس زمانے کے عام رنگِ طبیعت کے مطابق شاعرانہ احساسات اور خیالات کو زیادہ دخل تھا۔ انھیں نثری دستاویز سمجھنا اور دارالافتا میں لے جانا صحیح نہ ہوگا۔

شبلی کی نئی شاعرانہ اور جذباتی زندگی کا پہلا رنگین مرقع دستہ لگے ہے جس کی غزلیں ستمبر ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کے شان نزول کی نسبت احمدی حسن کو اکتوبر ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں ممبئی سے لکھتے ہیں:-

"۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دھیمپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا۔ پالو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہے اور چوپانی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے۔

کنار آب چوپانی دگلگشت پالو

۱۹۰۶ء مولانا عبد السلام ندوی کی غیر مطبوعہ حیاتِ شبلی کا ایک حصہ ادیب علی گڑھ کے شبلی ممبرین شائع ہوا ہے۔ ہم نے یہ اقتباسات وہیں سے لیے ہیں۔ مرمز ۱۴۲ - ۱۴۳

اس غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

بہر سوز و غم دلبرانِ شبنم بے پروا
گر زشتی از سر بردہ مشکل افتاد است بہر پروا
تین چار غزلیں لکھیں جو کبھی آپ کی نظر سے گزریں گی

دستِ گلِ صبحِ معنوں میں ایک پھولوں کا گلہ تر ہے۔ اور پھول بھی ایسے جن کی شادابی اور
خوبی رنگ و بو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب نہیں۔ یہ غزلیں الفاظ کے انتخاب خیالات کی
تازگی اور طرزِ ادا کی شستگی میں ترشے ہوئے ہیرے ہیں لیکن جذبات کی شدت دکھیں تو ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ ایک زبردست طوفانی دریا جو نہ توں اینٹ پتھر کے ایک بند سے ٹکراتا رہا۔ اب بند توڑ
چکا ہے۔ اور پورے زور شور سے بہ رہا ہے۔ پہلی غزل ہے۔

چند بے ہودہ بہ بندِ غم دنیا باشم
زبیں سپس باقدح و بادہ و مینا باشم
جبہ سائے حرمِ کعبہ جو بدم یک چند
بر درِ بنگلہ ہم ناصیہ فرسا باشم
گھرِ چند می و ہوسِ شیوہ دانا نمود
حاجتم نیست کہ فرزانه و دانا باشم
بادہ ہر چند تہ خرقہ توان نیز کشید
ز گس مستِ خواست کہ رسوا باشم
ایک اور غزل میں اسی کیفیت و سرستی کا اظہار ہے۔

اند کے نیز بہ کام دلِ خود میں باشم
روزگارے جو دم از دانش و عرفانِ دہ ام
چند در پردہ توان کرد سخنِ قاش نجیے
سنگِ بر نشینہ و تقویٰ ز دہ ام۔ ہاں ز دہ ام
داستانِ گدوم انیل پس کہ بہ این ہد و رخ
بابتان جامِ طرب بانے درستانِ ز دہ ام
ساغرے چند بہ یادِ رخِ نگینِ خور دم
قدحے چند در آغوشِ گلستانِ ز دہ ام
جامِ زہد جو بر قامتِ من راست نمود
نیشہ و تقویٰ سی سالہ بہ سندانِ ز دہ ام
اسی غزل میں آگے چل کر کہتے ہیں :-

آں شدائے دوست کہ آراستہ بیکہ فن
نقشِ زیبا صنتے بر ورقِ جاں ز دہ ام
آں شدائے دوست کہ در ندہ بہ بیتی بازم
مردم از صحبتِ آں دشمنِ مایاں ز دہ ام

ہاں دہاں دست بلدیہ زمین اے احباب کو بیزباستے دست پر پیاں دہ ام
 لطیفہ: شبلی نے اپنا مفہوم واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور نہ
 صرف دستہ نگل کی غزلوں بلکہ مکاتیب شبلی میں جا بجا بمبئی کا ذکر ہے۔ لیکن جس حسن ظن سے دیوان غزل کی
 شریحیں لکھی جاتی ہیں، بالکل اسی کو کام میں لا کر سید سلیمان دوسرے شعر کے ”دشمن ایمان کی نسبت فرماتے ہیں“
 وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے۔ وہ غلطی سے اس دشمن ایمان کی تلاش میں ہیں
 کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھلے یعنی کہ وہ علی گڑھ کی تحریک سے الگ ہو کر نندہ میں
 شامل ہو گئے! (حیات شبلی ص ۲۵۲)

سید صاحب کے اس تبصرہ کی نسبت پروفیسر محمد ابراہیم ڈار لکھتے ہیں۔ ”اس تاویل کو پڑھ کر
 آدمی دم بخود رہ جاتا ہے۔ اتنی صریح اور واضح بات کی یہ دُور از کار تاویل کہاں تک بجا ہے۔ اس کا
 فیصلہ ناظرین کرام خود کر سکتے ہیں“ (مضامین ڈار ص ۲۳۸)۔ مولانا عبد السلام ندوی لکھتے ہیں
 کہ دستہ نگل والے مجموعہ کا نام پہلے بمبئیات تجویز ہوا تھا۔ (ادیب۔ شبلی نمبر مر ۱۳۲)
 دستہ نگل کی پہلی غزل کا مقطع ہے ۷

میں نے مہربانی نہ کر دیا
 دامنِ ممبئی از کفِ ندیم تا باشم

دوسری غزل تمام کی تمام ممبئی کی تعریف میں ہے۔ مطلع ہے ۷
 نثارِ ممبئی کن ہر متابعِ ہنسہ و نورا طرازِ مسندِ جمشید و قریحِ تاجِ خسروا

ایک اور جگہ کہتے ہیں ۷

زرد و قہ طبع شبلی من در اولِ دہم
 بیایینا کہ ہر شوکا و اں در کار و اں مینی
 بحر در آشوبِ گاہِ ممبئی در بازہِ دایم
 بتانِ آذری را دلبرانِ شامِ دایران

دستہ نگل میں تین طرح کی غزلیں ہیں۔ پانچ ابتدائی غزلیں تو وہ ہیں جو شبلی نے ۱۹۰۶ء میں
 ممبئی میں یا ممبئی سے واپس آتے وقت لکھیں۔ پچھریں غزلیں ہیں جو آلہ آباد یا لکھنؤ میں لکھی گئیں۔ دیوان
 کا تیسرا حصہ وہ ہے جو دسمبر ۱۹۰۶ء میں ممبئی واپس جاکر لکھا گیا۔ پہلی دو تین غزلیں تو ایسی ہیں جو
 آغا محمد علی کے سامنے پڑھوائی گئیں۔ دوسری دو غزلیں فروانی کا بیان ہیں، لیکن چوتھی غزل دیکھ کر خیال

ہوتا ہے کہ اب اس آسمان پر ایک ماہتاب نمودار ہو گیا ہے اور مولانا کے اشعار عام شاعرانہ خیالات کا اظہار نہیں بلکہ کسی ماہ تمام کی طرح سرائی کے گیت ہیں۔ اس غزل میں مولانا لکھتے ہیں ۷

ہاں وہاں دست بلارید زمین اے احباب کمر بہ زریا صحنے دست بہ پیمان زدہ ام
کس چہ دانند کہ بر خلوت گہراں ماہ تمام زدہ ام ساغر و بر بادِ حریفان زدہ ام
مقطع میں توصات اظہار ہے ۷

پے تو ان بڑ کہ انی مز مہ بے چینی نیست شبلی اس تازہ نورمانہ چون مستان زدہ ام
ستمبر ۱۹۰۶ء میں تو شبلی کو ماہ تمام کی فقط ایک آدھ جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن
۱۹۰۷ء کے آخر اور ۱۹۰۸ء کے شروع میں انھیں موقع ملا کہ وہ آرام و اطمینان سے اس کی
تنبیاریوں سے حظ اٹھائیں۔ مئی ۱۹۰۷ء میں ان کے پاؤں کا واقعہ پیش آیا۔ اور وہ پاؤں بنوائے
کے لیے دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمبئی روانہ ہو گئے۔ اب جب تک پاؤں تیار نہ ہو جاتا، ان کا
بمبئی رہنا ناگزیر رہتا تھا ۷

اسی تقریب اُس گلی میں رہے
منیتیں ہیں شکستہ پانی کی !

چنانچہ وہ دسمبر-جنوری اور فروری کے کچھ دن بہارستان بمبئی میں رہے۔ بڑی
پرہیزگاہی و تقاضی میں شریک ہوئے۔ اور وسط فروری میں ندوہ کے ضروری کاموں کے لیے
بالکل مجبور ہو کر اور کسی قدر کراہت و تکلیف کے ساتھ لکھنؤ واپس گئے۔ اس دوران میں بڑی
دل چسپیاں رہیں، جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ اور پچھلے سال کی بعض غزلوں کے ساتھ

۱۔ مثلاً شروع فروری میں بمبئی میں دو مسلم خواتین کا ایک لیکچر تھا۔ بد مردوں میں شمس العلماء مولانا شبلی
نعمانی ”شریک جلسہ تھے۔ (ملاحظہ ہو۔ پیسہ اخبار ۷ فروری ۱۹۰۸ء) اس کے بعد ان خواتین
نے ایک شاعری تماشا، (Tableau) کرنا چاہا تو تاریخی معلومات شبلی نے فراہم کیں۔ لیکن افسوس کہ
تماشے کے انعقاد سے پہلے انھیں لکھنؤ جانا پڑا۔

(ملاحظہ ہو عطیہ نگیم صاحب کی (قلمی) خانقاہی ڈائری)

ایک گلہ تھے میں بندھ کر دستہ رگل کے نام سے شائع ہوئیں۔

بمبئی میں مولانا شبلی کے جس خاندان سے مراسم بڑھے۔ اس میں دو بہنیں تھیں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ۔ مولانا ان کے والدین آفندی صاحب کے قسطنطنیہ میں ۱۸۹۲ء میں مل چکے تھے اور ان کی مہمان نوازی اور وطنی محبت کے معترف تھے۔ ان دونوں بہنوں نے اس زمانے کی مسلمان خواتین کے مذاق کے خلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پردہ نہ کرتی تھیں اور قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتی تھیں مولانا ان سے بڑے متاثر ہوئے اور دونوں کے نام ان کے جو مکتوبات خطہ طرابلسی کے نام سے شائع ہوئے ہیں دستہ رگل اور گولے گل کی عقبی سر زمین کو روشن کرتے ہیں۔

خطوط طرابلسی میں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ دونوں کے نام خطوط ہیں۔ لیکن زیادہ تر عطیہ صاحبہ سے خطاب ہے۔ اور مولانا کو اس قابل اور بالکل بہت سارا لڑکے نے جس طرح متاثر کیا

۱۰ دستہ رگل کے سرورق پر ایک ذیلی عنوان میں بتایا گیا ہے کہ یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۰۶ء سے اپریل ۱۹۰۷ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ لیکن بعض قوی شواہد کی بنا پر ہماری رائے ہے کہ اپریل ۱۹۰۷ء "سہو کتابت ہے۔ صحیح مینا" اپریل ۱۹۰۸ء ہے۔ وجہ بالا اختصار یہ ہیں۔ (۱) اس مجموعے کی بیشتر غزلوں کے ساتھ مادمال تحریر درج ہیں۔ دارالمصنفین کے شائع کردہ دستہ رگل (۱ شاعت ۱۹۱۷ء) میں سرغزلیں ایسی ہیں جن کا ماہ رسالہ تحریر اپریل ۱۹۰۷ء کے بعد کیا بتایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض (۵؟) غزلوں کا سالی لکھتے وقت پھر غلطی کی گئی ہے۔ لیکن بالجمہ پندرہ غزلوں کی نسبت تصریح ہے کہ وہ سفر و قیام بمبئی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا تذکرہ زیادہ تر دسمبر ۱۹۰۷ء درج ہے۔ (۲) مولانا شبلی ۲ مارچ ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں ہمدی گوکھپوری کو لکھتے ہیں :- "بمبئی میں بڑی دل چسپیاں رہیں جو مینوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ ۱۶ صفحے ہوئے تو چھپنے کو دے دیے۔ اس میں کچھ پچھلے سال کا بھی حصہ ہے۔" (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۲۱۴-۲۱۵) ۲۳ مارچ ۱۹۰۸ء تک دستہ رگل کی چھپائی مکمل نہ ہوئی تھی اس تاریخ کا عطیہ بیگم کے نام ایک خط ہے۔ اس میں لکھتے ہیں چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے۔ تیاری پڑھنے والوں کا مجموعہ چھپنے کی پہلی اطلاع جو ہماری نظر سے گزری ہے زہرا بیگم صاحبہ کے نام ۲ مئی ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں ہے۔ میر جٹاٹا فارسی دیوان یعنی مال کی غزلیں بھی ہیں۔ — ظاہر ہے کہ جس مجموعے کی نسبت مئی ۱۹۰۸ء میں لکھا جائے کہ اس میں حال کی غزلیں چھپ رہی ہیں ان میں دسمبر ۱۹۰۷ء کی غزلیں شامل ہوں۔ اس کا اپریل ۱۹۰۷ء میں اختتام سہو کتابت ہی ہو سکتا ہے۔

تھا، اس کا اندازہ خطوطِ شبلی کے بعض اندراجات سے ہوتا ہے۔
ایک خط کا آغاز ہے :-

دُکِ سنگم، شرارے مے نو لیم
کفِ خلم، غبارے مے نو لیم

قوة عینی! تمہارا خط جو قدرت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھیں سے لگایا۔

اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔ ۱۰

ایک اور جگہ اپنے ایک شعر کا جس میں کنایتِ عطیہ یکم صاحب کا نام آتا تھا، لکھتے ہیں :-
اسی اصل پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمہارے لیے تیرے مقدم وغیرہ سب لکھ چکا
ہوں۔ اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر دو لکھا اور ہر موعے بدن تمہاری تمیغ
احد قرین کا ایک شعر ہے! ۱۱

خطوطِ شبلی مشرقی ادب میں ایک بالکل نونو کی چیز ہے۔ بظاہر تو یہ چند صفحات کا ایک مختصر مضمون
ہے لیکن ان چند صفحات میں ہی ایک مکمل دورِ امرہ آگیا ہے۔ اور اس انداز سے کہ اس میں آدرا اور تصنیع کا
کاشما یہ نہیں ان خطوط میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک نئی ہے جو پہاڑی چشموں سے چھوٹی ہے۔ پہلے
گنڈا دل اور غمزہ داروں کی سیر کرتی ہے۔ پھیلتی ہے اور تیز تر اور تند تر ہوتی جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ
مادیسی اور سرد مہری کے صحرائیں جاکر آنکھ سے نہاں ہو جاتی ہے۔

علامہ شبلی اردو زبان کے بہترین مکتوب نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے مکاتیب کے جو درد
مجموعے دار المصنفین نے شائع کیے ہیں ان میں بھی ایک خاص شان ہے اور وہ شبلی کے رنگِ انشا پروری
اور ایجاز کے نہایت خوشگوار نمونے ہیں لیکن ان میں ایک طرح کا عالمانہ تصنع اور آوڑ ہے۔ یوں تو بلا
پُورب کی وضع دار اور بالکل کلفت سز میں سے دورِ حاضر میں جتنے خطوط لکھنے والے پیدا ہوئے ہیں (مثلاً
حمدی حسن۔ نیاز فتح پوری) ان میں سے (دوسری بڑی ادبی خوبیوں کے باوجود) کسی کے خطوط بھی جتنے
اور نیرچل نہیں لیکن شبلی کی احتیاط قلم کی ایک خاص وجہ تھی۔ انھیں شروع سے ہی اپنی قابلیت اور صلاحیتوں

پراس طرح کا اعتماد تھا کہ وہ اپنے خطوط قلم سنبھال کر اور بدل لگا کر لکھتے تھے۔ وہ ابھی بیس برس کے ہیں اور دس روپے کی محافضی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ لیکن خط لکھیں گے تو فارسی میں۔ اور آخر میں کہیں گے ”نامہ رازگاہ دارید“ چنانچہ ان کے اس زمانے کے بعض خطوط محفوظ ہیں۔ مولانا کی اس خصوصیت نے ان کے مکاتیب میں ایک ادبی شان پیدا کر دی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان میں بے تکلفی اور انتہائی خلوص نہیں، جو خطوطِ شہابی کا زیور ہے، جن کی نسبت مولانا کو کبھی اس بات کا سامان گمان نہ ہوگا کہ ان کی اشاعت کی نوبت آجائے گی!

خطوطِ شہابی کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ دستہ نگل کی بعض غزلیں اسی نشے کا اثر تھیں جس نے خطوطِ شہابی کو ایک محکمہ کو بنادیا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ اس مجموعے کی کئی غزلیں کسی خاص لمحے کی یادگار ہے۔ اور اس میں کسی دلتے کی طرف اشارہ ہے، آسان نہیں۔ لیکن اس زمانے میں شہابی پر جو عام کیفیت مستی چھائی ہوئی تھی، اس کا اندازہ دستہ نگل کے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ غزلتے ہیں ۵

اے نمند خلوتیان حجاز را	دید کی تطاولی خم زلف دراز را
ہرگز یکے بہ خوبی، رعنائی تو نیست	مادیدہ ایم کج گلہان طراز را
بیچارہ نکستہ دانا دہائے عشق نیست	عنائے ممکن بہ غیر نگہ ہائے راز را
ہر چند چو ریز ز معشوق خوش بود	ما بندہ ایم دلیر عاشق نیاز را
آدر برم کہ کار اندازہ در گذشت	دست دراز گشتہ و آغوش باز را

شہابی اس عالم سرخوشی میں مستغرق تھے کہ انھیں مجبوراً اندوہ کے ضروری کاموں کے لیے مجبوری کو الوداع کہنا پڑا۔ لیکن اب انھوں نے وہ روابط جو مجبوری میں قائم ہو گئے تھے، برقرار رکھے اور لکھنؤ پہنچتے ہی عطیہ اور زہرا کو خط لکھے۔ ان خطوط کا سلسلہ ۱۶ فروری ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا اور ایک طرف سے محبت اور عقیدت اور دوسری طرف ادب و احترام کے بڑے بڑے گئے تھے، وہ چڑھتے گئے، لیکن ابھی چار پانچ خطوں ہی کی نوبت آئی تھی کہ عطیہ سیکم کو یورپ کا سفر پیش آیا۔ پہلے مولانا کا ”ازادہ اور قطعی اللہ“ تھا کہ وہ الوداع کہنے کے لیے خود بھی آئیں۔ لیکن پھر اس خیال سے رک گئے کہ ان کے لیے کسی عزیز دوست کی شخصیت کے وقت تحمل کرنا بڑا دشوار تھا۔ چنانچہ انھوں نے دوسرے خدا حافظ کہا اور ڈاک سے دعاغیہ نظم بھیج دی۔ ساتھ ہی ایک خط لکھا جس کے آخر میں ایک فارسی

شعر تھا ۵
مے روی دگر یہ مے آید مرا
ساعتے بخشین کہ باران بگذرد

شبلی نے عطیہ سے سفر یورپ کے دوران میں خط و کتابت جاری رکھی، لیکن وہ خطوں
بُوئے گل
محفوظ نہ تھے رہے۔ جب وہ اکتوبر میں اس سفر سے واپس آئیں تو شبلی نے ایک
ایسا خیر مقدم لکھا جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ بُوئے گل کی پہلی غزل ہے ۵

پیکِ فرخندہ قام شرہ سرا مے آید کمرِ سفر یار سفر کردہ مے آید
رفت از شہرِ بیل ساں کہ ہاں چمن آمد آن گونہ کہ در باغِ صبا مے آید
گوئیایوسف کم گشتہ بہ کتعال آید یا نگارِ مینئی سیدے صبا مے آید
رفتیش گریچہ کجہ دل احباب نہ بود چوں بیاید بہ مرادِ دل مے آید
خوئے خوش بہ ہاں طاعتِ صفا مے آید ہم بیل قاعدہِ حمرد و نا مے آید
بُوئے جانے کہ شامِ دل و جان تازہ کند مے توں یافت کز ان بندِ قبا مے آید
ہر کجا مے گزردِ غطرِ قشال مے گزرد ہر قسمی کہ از لُفِ دو تا مے آید
اے دغاے سحرانہ چرخِ فرود آکنوں کلاں کہ مے خواستی اور ابد عا مے آید

شبلی غم زدہ آؤر دل و دین بہ نثار
غیر ازین چہیت کہ از دست گداے آید

لیکن شاید یہ خیر مقدم ضرورت سے زیادہ شوخ سمجھا گیا۔ اور ملا ناکی مصلحت پسند طبیعت نے
گوارا نہ کیا کہ اسے عطیہ تک پہنچائیں اس کے لیے خیر مقدم کا ایک اور قطعہ لکھا گیا۔

نسیم صبح بیا و بہ مرد می پیش آ
پیام بندہ بہ آں خاکِ آستانِ بریں

اس کے بعد خطوط کا سلسلہ پھر سے جاری ہوا۔ اور شناسائی دوستی میں دوستی بے تکلفی
میں تبدیل ہو گئی۔ مولانا شبلی کے سب سے بڑے خطوطِ عطیہ بگیم کی ولایت سے واپسی کے بعد لکھے
گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بالوسی و کشمکش کے بھی کئی دور آئے۔ اور (نکاح ثالث کا)
جو لیکن خواب شبلی کی نگاہِ تصور نے دیکھا تھا اس کا پورا ہونا محال ہو گیا۔ واپس اگر عطیہ صاحبہ

جو پہلا خط لکھا، اس کے لب و لہجہ کی شبلی شکایت کرتے ہیں
میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالا کر دیا ہے۔
اس لیے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے ملیں۔ یا ان اطراف کا قصد کریں۔ جیسا کہ وعدہ
کیا تھا۔ اب صبح نہیں۔ خط کی تحریر بھی بہت رُکھی اور تھوڑا دیر ہے۔
جس روز شبلی نے یہ شکایت لکھی، اس سے اگلے روز یعنی ۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء کی ایک غزل میں بھی
ایسی دنگامی کا اظہار ہے۔

زجبال گزشتہم و بانم بہ برنے آید کمرغیت نہ دم دآں بُت بزر نئے آید
فراق و ہجر۔ دیار خوشے بود کہ درو پس اگر شبن شب ہم سحر نئے آید
مُجد از دوست شب باہتاب را بچشم کہ کار عارض او از قسم نئے آید
بر خوارے کہ ز کویے تورفت نعمانی

گھماں برم کہ از میں پس دگر نئے آید

اس کے سات روز بعد کی ایک غزل میں یہ اظہار اور بھی نمایاں ہے۔
آں شرح راہ من سہراں پُرس و مجو نمائد یعنی گل مراد مرا رنگ و جو نمائد
ہر صفحہ آں نوازش ظاہر ہماں بجا است پیدہست ایں آں روش پُرس و جو نمائد
شبتی ہر آنچہ داشت بہ دل بزر باں نکند گویا کہ کار با صنم تہند جو نمائد
اب حشر میں امیدوں پر غالب آگئیں۔ اور کیف آور آرزوؤں کی جگہ صوبان روح پالنے
لے لی۔ ماضی کے چر کیف لمحوں اور خواہرائے رنگیں کو یاد کر کے کہتے ہیں۔

یک سرو صد گونہ سودائے نہانے داشتہم یاداں روزے کہ من با خود جہانے داشتہم
یاد اں روزے کہ دور از باجراہے جہاں ماجراے بانگابہ نکتہ دانے داشتہم
یاد اں روزے کہ دست افتال گزشتہم ازرم از غریبہ آں کہ من ہم آستانے داشتہم
بیچ باک از گردش گردوان گروانم نہ بود محزونین کوچہ او آسمانے داشتہم

یاد آں روئے کہ من از سادہ لوحی ملے خود باعدوئے گفتار از زہلے دہشتم

شبلیاں جلوہ نیرنگہائے بمبئی

بود تا وقتے کہ من خواب گرانے دہشتم

بوسے گل میں جس میں ابر الکتوبر سے ہر نمبر تک کے احساسات نظم ہوئے ہیں، نو میدی و رنگامی کے کئی لمحے ہیں۔ شبلی خود مانتے تھے کہ دستہ گل اور بوسے گل میں جذب و سلوک کا فرق تھا۔ ایک میں جذب و مستی کے ایام کی داستان ہے اور دوسرے میں سالک راہ کو جن دشواریوں و تشیب و فرائس سے واسطہ پڑتا ہے، ان کا بیان ہے۔ ایک میں بلبل ہزار داستان کے سامنے دستہ گل ہے اور دوسرے میں ایسا نظر آتا ہے کہ پھیل کر جاتے رہے۔ فقط بوسے گل باقی ہے۔ دوسرے مجموعے میں مایوسی اور ناکامی کا کثرت سے ذکر ہے۔ لیکن جس طرح شبلی کی آرزوئیں اور امیدیں بے ثمر ثابت ہوئیں اسی طرح انتہائی مایوسیوں بھی بلاوجہ تھیں بلکہ ان غزلوں کو لکھے ہوئے ایک عینانہ ہوا تھا کہ انھیں خاص لکھنؤ میں اپنے ممدوح کے تیرم قدم کا موقع ملا۔ شبلی ۲۴ نومبر ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں ممدوحی حسن کو لکھتے ہیں:-

”بمبئی کا ہمان (مادمان) آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ شبلی اس کا پہلا جز

کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا لیکن بد قسمتی دیکھیے کہ ندوہ کے ماضو

کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

نہ وقت۔ نہ دماغ۔ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ اب صحبتوں

میں ان کی قابیلیتوں کے حیرت انگیز پہلوؤں سے گزر رہے ہیں۔ اردو۔ فارسی۔ انگریزی

فرنگ۔ زبان دانی۔ مصوری۔ نقشہ کشی۔ پائیکس۔ قوت تحریر۔ عہد

آئینہ عالم ہمہ سے داشت تو نہاداری

افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی۔ ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں

اس کے بعد خطوط میں زیادہ رنگ و نکت اور بے تکلفی آگئی اور شبلی نے اپنی بعض آسان اور

ناتابل اعتراف غزلوں کے اشعار عطیہ کو تفصیلی شرح کے ساتھ ارسال کیے۔ اگلے سال انھوں نے چند روزہ جزیرہ یا بمبئی میں مونٹ رنڈ پر رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ جزیرہ سے جہاں عطیہ کی بڑی ہمیشہ نازلی بیگم صاحبہ نواب صاحبہ بیابھی ہوئی تھیں، شبلی کو دعوت آئی۔ وہ دہلی۔ بمبئی سے جلتے ہوئے اکتوبر ۱۹۰۹ء کے دوسرے ہفتے میں جزیرہ پہنچے اور کئی دن تک اپنے کمرنگ ماؤں اور دوستوں کے ساتھ مقیم رہے۔ اسی زمانے کی ایک اردو غزل ہے ۵

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی	خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو درد دل بھی بسر کر لے گا اس قصرتی نہیں	اسے غلبہ بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہولے رُوح پر دُوبھی یہاں کی نشہ آور ہے	یہاں فکر مے جام و پوہنگی تو کیوں ہوگی
بنجاب ناز کی بیگم کو اور نواب صاحب	کسی شے کی جودل میں روزہ ہوگی تو کیوں ہوگی

کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سنو، یہ بہارِ ستار
عطیہ، اتم کو یاد رکھنؤ، ہوگی تو کیوں ہوگی

جزیرہ سے رخصت ہوئے تو واپس جا کر ایک قطعہ لکھا، جس میں جزیرہ کی صحبت کا رنگیں کو یاد کر کے کہا ہے ۵

یادِ صحبت لائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں	وہ جزیرہ کی زمیں تھی۔ یا کوئی سے خانہ تھا
لطف تھا۔ ذوقِ سخن تھا۔ صحبتِ احباب تھی	مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبز و گل سے بھرا تھا دامنِ کوسا۔ سب	غیرتِ جلد بریں ہر گوشہ دہرا نہ تھا
غنیچہ گل کا تہنم تھا۔ ہر اک دم برق ریز	عندلیبوں کی زباں پر نالہ مستانہ تھا
نقشہ آور تھی نگاہِ مستِ ساقی اس قدر	خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلستے وہ لطفِ سخن	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو گستاخانہ تھا

مولانا ایک خط میں بھی جزیرہ کی صحبتوں کو یاد کر کے کہتے ہیں۔ "جزیرہ کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے۔" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ کا سفر ان کے لیے بہت مبارک ثابت نہ ہو سکا اور

حرم دوست کی کوئی چیز انہیں برابر کھٹکتی رہی۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک معذرت آمیز انداز میں جزیرہ کے تعریفی قطعہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ اشعار اب وہ ہوا کی لطافت نے اس وقت ارتجالاً لکھوائے تھے۔ اور یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس سال انہوں نے بمبئی اور جزیرہ کے قیام میں کوئی غزل نہیں لکھی۔ حمدی حسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”بمبئی سے اب بالکل خالی ہاتھ آیا۔ ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہو سکا۔ اس شکایت میں ایک غزل لکھی۔ وہ بھی وہاں سے نکل کر اس غزل کا ایک شعر ہے۔“

واغم کہ بہارِ حسین بمبئی امسال

بر عادتِ پیشینہ جنوں خیز تر ہو وہ است

حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آ رہا تھا کہ شبلی کے خواب ہائے رنگیں خواب پریشاں ہو جائیں۔ وہ عطیہ سیکم کی قابلیت، ذہانت، وسعت معلومات کے معترف تھے۔ اور عطیہ ان کی انشاپردازی اور تصنیفی شہرت کی قدر کرتی تھیں۔ لیکن ان کی عمروں اور طبیعتوں میں جو تفاوت تھا وہ کسی ترویجی رشتے بلکہ پائیدار دوستی کے لیے سازگار نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شبلی اس تفاوت عمر کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب زہرا نے ایک دفعہ شبلی کی صاحبزادیوں کو بہن کہہ کر خطاب کیا تو شبلی نے انہیں ٹوکا:-

ہاں۔ آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا ہے۔ عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن

یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم زہرا اور عطیہ کے والد عمر اور ہر حیثیت سے میرے

چچا تھے۔ اسی لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہیے۔ میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے

لہذا اس لیے آنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں ہے۔

لہ جزیرہ کی تعریفی غزل کی نسبت عطیہ سیکم کی خاندانی دائری میں ذیل کا اندراج ہے:-

آخر مولانا شبلی صاحب پور مشیر حسین قدوسی صاحب یہاں تشریف لائے۔ مدلولی وعدہ تھا۔ مگر مارے شکر کہ ابھی

اکتوبر کو یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے۔ مولوی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی جزیرہ اس بلکہ کے تعلق کے۔ ان کی شاعرانہ

طبیعت جو شمس الگئی۔ اور یہ غزل کوئی دو گھنٹے کے عرصے میں لکھ کر بھیج دی تھی کہ کیا نہ تھا۔۔۔ الخ غلط خط و کتابت۔

شبلی اور عطیہ میں شاید بیس سال کا فرق تھا۔ ان دونوں کے درمیان خیالات کی ہم آہنگی
 ہی بڑی مشکل تھی۔ لیکن بعض واقعات بھی ایسے رونما ہوئے جن سے تعلقات کی خوشگواہی کو صدمہ پہنچا۔
 اس سے کچھ عرصہ پہلے عطیہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدرسہ ندوۃ العلماء کا سنگ بنیاد ان
 کی ہمیشہ نازلی سکیم سے رکھوایا جائے، لیکن ندوہ کے علما تو عطیہ سکیم کو ہی اپنے جلسوں میں نہیں آنے
 دیتے تھے۔ وہ ان کی ہمیشہ کے سنگ بنیاد رکھنے پر کس طرح راضی ہوتے۔ پناچہ شبلی نے عام مخالفت اور
 مولویوں کی برکھی "کاغذ پیش کیا، جو فی الحقیقت بجا تھا، لیکن ایک بہت سارہ لڑکی ان پیچیدگیوں کو
 کیا سمجھے۔ اس نے انھیں بدتمی "لاطعن دیا۔ اس کے جواب میں شبلی نے لکھا:-

تم کہتی ہو کہ میں "بہت بدتمی" ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ
 اور پبلک۔ اگر پبلک امیر سے ہاتھ میں نہ ہو تا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔

تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کس مشکلات ہیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر عوام کی فحش
 کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً برباد ہو جائے۔

شبلی نے سکیم صاحبہ کے سنگ بنیاد والی تجویز پر تو عمل نہیں کیا، لیکن جب ان کی ہمیشہ نے
 ندوہ کی امداد کے لیے کچھ رقم ارسال کی تو اس کے شکریے کا قطعہ لکھا۔ اس کا ایک شعر تھا:-

نازم کہ این عطیہ رفیع امیرہ ایست
 کاواڑہ سخا شہ عالم رسیدہ است

بدقسمتی سے اس شعر میں لفظ عطیہ کا کنایہ استعمال بھی اختلاف کا سبب بن گیا۔ اور جزیرہ
 سے نکل کر شبلی نے ایک طویل طویل خط اس کی محذرت میں لکھا۔ اسی زمانے میں رسالہ الندوہ میں
 مسٹر مشیر حسین قدروالی کا مضمون عورتوں کی تعلیم کے متعلق شائع ہوا۔ جس پر عطیہ سکیم نے اعتراض کیا۔
 اس کے دو مین جہین بعد نانو شکواری بحث کا ایک اور موقع پیش آیا عطیہ صاحبہ نے اپنے کسی خط میں
 علی گڑھ جانے کا ذکر کیا تھا۔ شبلی نے جواب میں کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا، جنھیں مکتوب الیہا نے
 علی گڑھ کی بلاوجہ تحقیر سمجھا۔ اور بہت برہم ہوئیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے!

چنانچہ انھوں نے سائیک "غضب اکوہ خط" شبلی کو لکھا۔ جس کے جواب میں شبلی نے ۱۳ جنوری ۱۹۱۰ء کو اپنا مشہور زیادہ واضح کیا۔ اور معذرت پناہی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے دل صاف نہیں ہوئے۔ اب القاب میں عزیزی کی جگہ "ماتون مترم" نے لے لی۔ اور خط ملا کالب لبریک تحت بدل گیا۔ مدت کے بعد جب ادھر سے ایک شفقت بھرا خط آیا تو شبلی کے قصور نے پھر انگڑائی لی۔ اور دفعہ بہت مردہ خیالات بھر زندہ ہو گئے۔ اب انھوں نے پھر "عزیزی" سے خطاب شروع کیا۔ بلکہ تصویر کی عواش کی، لیکن غالباً جواب حوصلہ افزانہ تھا۔ شبلی کے دل میں عطیہ کی یاد آخر تک ایک خوش گوار نقش کی طرح محفوظ رہی۔ کبھی کبھی ملاقاتیں بھی ہوئیں، جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔ لیکن ٹوٹے ہوئے دل پھر نہ جڑ سکے۔ بعد کے خطوط رسمی اور معلوماتی قسم کے ہیں۔ آخری خط ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کو بمبئی سے (جزیرہ) لکھا گیا۔ ابتدا کی سطر یہ ہیں :-

"اس ستم ظریفی کو دیکھیے۔ حیدر بھائی میں رہیں۔ اور مطلق غریبہ دی۔ خبر تھی۔ کہ بیگم صاحبہ بھوپال کے ساتھ ولایت جا رہی ہیں۔ اس لیے زہر صاحبہ کو لکھا۔ وہ چپ رہیں۔ بہت پر تڑکایا کہ بھائی میں تم ہو۔ تو آؤں۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ ۶ مئی کے بعد زہر صاحبہ خط آیا کہ سب لوگ بخیر ہو آگئے۔ اب جا کر یہ خط آیا سبحان اللہ!"

عطیہ بیگم سے تو اس کے بعد خط و کتابت ختم ہو گئی اور اگلے سال کے آخر میں ان کی شادی سرانجام پا گئی۔ لیکن ان کی ہمیشہ زہر فیضی سے نامہ و پیام جاری رہا۔ بدیشہ سرکئی، مختصر رقعات تھے۔ لیکن آخری خط بڑے مولانا نے اپنی وفات سے کوئی پانچ ہفتے پہلے لکھا۔ بڑا دردناک اور اخلاص و محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ انھی دنوں ان کے بھائی اسحاق کی وفات ہوئی تھی جس نے ان کا کاروبار زندگی درہم برہم کر دیا تھا۔ عطیہ ان دنوں یورپ میں تھیں۔ خط کے آخر میں ان کی نسبت لکھے ہیں :-

عطیہ اگر آجائیں۔ تو بہت سلام شوق کیجیے۔ اور کہیے کہ کاش وہ میرے گھر کر
تحریت کرتیں۔ کہ دل کو تسکین ہو سکتا لیہ

عطیہ سلیم سے شبلی کو جو تعلق خاطر تھا، اسے ہم نے تفصیل سے بیان
کر دیا، لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ ان جذبات کی نوعیت ایک

خطوطِ شبلی کی صحیح تعبیر

”گناہ کی تھی جس کا ستر مہا پیچہ“ تو ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سید سلیمان نے حیاتِ شبلی
کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں یہ نقوش پوری طرح نہیں بھیتے، لیکن اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان نقوش میں
برائی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب نے اپنے خیال میں استاد کی خیر خواہی کی خاطر جو تصویر پیش
کی ہے، اس کے بعض عناصر حقیقت پر مبنی نہیں۔ کم از کم اس معاملے میں ان کے استاد کا وہ طریق کار نہ
تھا جس پر سید صاحب حیاتِ شبلی میں عمل پیرا ہوئے۔

شبلی نے عطیہ کی نسبت اپنی رائے کو ”گناہ“ نہیں سمجھا۔ اور فی الحقیقت ایسا سمجھنے کی کوئی وجہ
بھی نہ تھی، اور نہ ہی اس پر پردہ ڈالنے کی بڑی کوشش کی۔ عطیہ کے خطوط ان کے نام آتے
تھے، انھیں بھیچانے کی وہ بہت کوشش نہ کرتے تھے بلکہ ان کے اقتباسات دُور دُور بھیجتے تھے۔
۱۹۰۹ء کے ایک خط میں اُسے لکھتے ہیں:-

اب تو تمھارے خطوط ایسے پرتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر مٹاتا ہوں اور لوگ
سر دھنتے ہیں۔ پالی ٹیکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے
جیدر آباد اور رالہ آباد بھیجے۔

یہ ذکر و تذکرہ بے تکلف مرد و مستوں تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اپنی بیٹی کو بھی عطیہ کے خطا بے
فخر کے ساتھ دکھاتے اور گھر کی دوسری عورتوں سے اُس کا تذکرہ رہتا۔ ایک خط میں عطیہ کو لکھتے ہیں:-
میری لڑکی علاج کے لیے آئی ہے۔ وہ تمھارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے
کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔

ایک اور خط میں ہے:-

...تم ضرور الہ آباد اور افسوس ہے کہ میرے خاندان کی عورتیں اس وقت وہاں نہ
ہوں گیں۔ ورنہ تم سے بڑے شوق سے ملتیں۔ کیونکہ تمہارا اکثر تذکرہ میری زبان سے
سنتی رہتی ہیں۔

کیا علامہ شبلی کی ان تحریریں کو پڑھ کر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی
ان تعلقات کو گناہ سمجھتے تھے۔ اور ان پر ”پردہ“ ڈالنا ان کے خیال میں ضروری تھا؟
عطیہ سے مراسم قدیم طنز کی ثقہ، مستیوں کو ناپسند ہوں گے۔ لیکن شبلی قدیم طنز کی ایک ثقہ
بستی نہ تھے۔ پھر ان میں ”گناہ“ کے اصل مفہوم والی کوئی بات نہ تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان مراسم کی
تہہ میں فقط ایک شاعر کے متعلق جذبات نہ تھے، بلکہ دوسرے عوامل کے علاوہ شبلی کے ان خیالات کو
بھی دخل تھا، جو وہ عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے متعلق رکھتے تھے۔ اور جن کا اظہار علی گڑھ آنے کے
جلد بعد شروع ہو گیا تھا۔

قلب انسانی کا معاملہ بڑا گہرا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ ایک جذبے کے لیے پشت بہت سے
محسوس اور غیر محسوس اثرات کا دریا ہوتے ہیں۔ عطیہ سے شبلی کے لگاؤ کا کامل تجزیہ تو ایک عالم نفسیات
کا کام ہے۔ لیکن شبلی کے خطوط سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ عطیہ کی قابلیت سے بے حد متاثر تھے۔
اور ان کی مسلسل کوشش تھی کہ یہ ذہین، لائق اور اولوالعزم لڑکی اپنی قابلیت اور قوتِ تقریر و تحریر سے
ان خرابیوں کو حقیقت بنادے، جو عورتوں کی تعلیم اور مناسب آزادی کے متعلق ان کے دل میں تھے۔ اور
جن کا تفصیلی اظہار انھوں نے سفر نامہ روم و مصر و شام میں کیا تھا۔

پہلے خط میں ہی عطیہ کے ”مشن“ کا ذکر ہے۔ دوسرے میں اس کے متعلق اپنی ”اسکیم یا تجویز“
کا ذکر ہے۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں، جو انگریز
اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ آگے چل کر لکھا ہے: ”اگر یہ موقع ملا تو میں پھر جاؤں گا کہ تمہاری
کچھ علمی خدمت کر سکوں، تم کو فارسی پڑھاؤں اور اردو کی انشا پر بازی سکھاؤں۔“ یہی خطوط میں اس
کے مہربانی والے بازاری محاوروں کی اصلاح کی ہے۔ دوسروں میں فارسی اشعار کے معنی بتا کر ان کے

رموز و مطالب سمجھائے ہیں۔ بعض میں موسیقی سیکھنے کی تلقین ہے۔ اور اس کے طریقے بتائے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

عطیہ: تم کو معلوم ہو گا کہ فرانس میں سب سے پہلے اکاڈمی ایک لینڈی نے قائم کی تھی
تم کو یہ موقع ہے۔ خود علمی مذاق ہے۔ اور اہل مذاق بمبئی میں جمع ہو سکتے ہیں۔

خطوط شبلی میں جا بجا اس طرح کی تجویزیں اور مشورے ہیں۔ مکاتیب شبلی کے بھی کسی
اندر لجات سے اس احترام کا پتا لگتا ہے، جو شبلی کے دل میں عطیہ کی قابلیت کا تھا۔ ایک خط میں
مہدی حسن کو لکھتے ہیں: بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے ہیں۔ ان صحبتوں میں اس کی
قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلوؤں پر گزر رہے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی، فرنگی، زبان دانی، معنوی
نقشہ کشی، پالیٹیکس، قوت تحریر و خط

انجہ عالم ہمہ می داشت، تو تنہا داری

عطیہ بگم سے شبلی نے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں، اس میں ان کی طبعی رومانیت کو بھی دخل
تھا۔ لیکن یہ بھی انصاف نہیں کہ اس دل بستگی کے علمی اور اصلاحی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے۔
اس دل بستگی میں دو چیز جذبات کے علاوہ بڑے شبلی نے ایسے دلاویز اشعار میں ادا کیا، اور بھی بہت
کچھ تھا۔ اس میں غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کی بہت اور الواعزمی کے لیے احترام، پولیٹیکل
خیالات سے (بالخصوص) کم وقت فرقہ، جدیدہ کی نسبت، اتفاق رائے، یہ سب باتیں شامل تھیں۔
اور ان سب کے پس پشت یہ ارمان کہ ان کے ایک کم فرما کی بیٹی، جس کے خاندان میں پردے کا رواج نہیں
”ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔“
اور اب جو ”وہ اس میدان میں آچکیں، جو کچھ ہر کمال کے درجہ پر ہو۔“
شبلی اس جذبہ کو گناہ نہیں سمجھتے تھے۔ سوائے معاہدین یا خاص اہل احتساب کے اس پر
پر زور نہ ڈالتے تھے۔ ان کے دل میں تو یہی چور نہ تھا۔

2

•

غزلیاتِ شبلی

شبلی نعمانی

دستِ گل

یعنی

غزل ہمارے چند

از

شبلی نعمانی

(باہتمام منشی محمد شام حسین ۱۹۰۸ء)

مطبوعہ قومی پریسنگ کمپنی

معذرت

هرزه چند هم بافتن و پیش کسان عرضه دادن نه پسندیده عاقل باشد
 من هم این کار نمی خواهم از دل اما چه توان کرد چو فرموده بیدل باشد

یعنی سید حامد حسین صاحب بیدل شاه جهان پوری

بسم الله الرحمن الرحيم
غزل کا جدید

چند ہیودہ یہ بندِ غم دنیا باشم جیہ سارے حرم کعبہ چو بودم یک چند گرچہ زندگی و ہوس شیوہ دانا نبود بادہ ہر چند تہ فرقہ توان نیز کشید مست و پر عہدہ تنگش بکشم و دا خوش باہم دعویٰ تمکین نتوانخ است زن جلوہ او نگذارد کہ برم بہرہ ز وصل ای خوش آن روز کہ رازم قنداز پڑہ بود مقتب دست بدایان من، من مست	زین پس باقدح و بادہ دینا باشم بر در بست کدہ ہم ناصیہ فرما باشم حاجتم نیست کہ فرزاند دانا باشم نرگس مست کسی خواست کہ جا باشم تشنہ و سلم و تاکہ بہ جا باشم کہ تو از پردہ بدر آئی و بر جا باشم بد صبح و ہان محتاشا باشم از دوسو خلقے من غنّی ہو باشم دست درد من آن شوخ خود را باشم
---	---

بزم نشہ	دامن عیش زدستم زود تاشلی دامن بکبی از کف ندہم تا باشم	بج
---------	--	----

نثار بکبی کن ہر متاع کمنہ و نورا غزل طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را

به هر سوز از هجوم دلبران شوخ بے پروا فغان از گرمی هنگامه خوبان نریشتی بده ساقی می باقی که در جنت غنچه یافتی	گذشتن از سر ره مثل قنار دست در هر دورا بهم آیمخته از زلف عارض ظلمت و صورت کنار آب چو پللی گلگشت پا لورا
بزم کسره	بیا بشلی به یاد پنجه گیر ای مژگانش دگر ره پاره سازم این قبا بی زده صد تورا
غمزه پیش طرح نهد رسم جاکوشتی را بسنگر معجزه حسن که آن ز گس مست من فدا سبب غنچه که هنگام صال می به اندازه زدن گره در سبب مست قدیم	جلوه یادت دهد از خویش فراموشی را بهم آیمخته هشیاری و مدحوشی را بمن آموخت خود آئین هم آغوشی را طرح نو در فلک آئین قدح نوشی را
کسره	بشلی نامه سیه گرچه سراپا گشته است بس بود دامن عفو تو خطا پوشی را
گردم از دجست فیروز صفایان زده ام بکلی بود مرا منزل مقصود و عبث ساغر زند گیم (حیف) که جز در دشت	شرم بادم که نوا به پریشان زده ام پیش ازین گام طلب راه حیران زده ام جز همین جریه آخر که به پایان زده ام
سه پارسیان دو خدا را معرفت هستند یزدان و اهرمن و اینهارا به نور و ظلمت هم تعبیری کنند.	

اندکے نیز بہ کام دل خود میں با ششم
 چند در پردہ توان کرد سخن، فاش گوی
 داستان گروم ازین پس کہ بزمین دروغ
 ساغر ^{مشور شدن} چند بیاد رخ رنگین خوردم
 مے درینجا نتوان خورد نہانی زین پس
 تا ازین ہر دود بہ جان کہ خطر خواہد بود
 از پریشانی ایام میندیش کہ من
 کارم افتاد بہ آن بادشہ کشور حسن
 آن نگار عجمی چہرہ بد انسان افروخت
 جامہ زہر چو بر قامت من است نبود
 آن شد اے دوست کہ آراستہ بکیر فن
 آن شد ای دوست کہ در مہر ہب بینی نام
 بان وہان دست ہارید ز سن امی احباب
 ہر یک از فتنہ گران عرب ہند عراق
 کس چہ داند کہ بہ غلوت گر آن ماقہ تمام

روز گاری چو دم از دانش و عرفان نودہ ام
 نگ بشیشہ تقویٰ نودہ ام ہان نودہ ام
 بابتان جام طرب با نئے بوستان نودہ ام
 حد سے چند در آغوش گلستان نودہ ام
 فاش گویم ہم ازان بادہ کہ پہنان نودہ ام
 دوش پیانہ مے بر سر پیان نودہ ام
 دست در حلقہ آن زلف پریشان نودہ ام
 دست رد بر چشم قیصر حسن قان نودہ ام
 کاکش آوردم و در خرمن ایمان نودہ ام
 شیشہ تقویٰ سی سالہ بہندان نودہ ام
 نقش زیر باصنمے بر ورق جان نودہ ام
 کہ دم از صحبت آن دشمن ایمان نودہ ام
 کہ بہ زیر باصنمے دست بہ پیان نودہ ام
 ہم حسن است دین دل دہ طوفان نودہ ام
 زودہ ام ساغر و بر یاد و یمنان نودہ ام

جای آنست که گلشن دمد از کج لبم صد چمن لاله و گل جو شدم از جیب بغل صد دکان لعل و گهر چیده ام از گفتارش بوسه با بر لب نوشین زده ام از پله هم تا دگر آن بت خود کام زیادم نه برود سالمه گوش جهان ز منزه را خواهد بود	بوسه با بسکه بر آن حاض خندان زده ام قرعه فال هم آغوشی جاسان زده ام طعن بر بے سر بسانی عمان زده ام طوطی گر سنه ام بر شکرستان زده ام گر چه چند دران زلفت پریشان زده ام ازین لوا که درین گنبد گردان زده ام
لحم	پے توان برد که این ز منزه به چیز نیست ششلی این تازه لوا نه چوستان زده ام
دوش کان لدار با من هم دفاق افتاده بود حالیاس هم چو زاهد پارسانی شیوه ام از بهرامن آشنائی داده ام با عاشقی گویند دشمن هم از دقت نصیبی بوده است گر چه من مرد بهو سبازی زندی میتم زاهد دارم ندامت می زند بن خیرگیست بوده ام در بزم به با مختب هم نوشین	غفلت در گنبد فیروزه طاق افتاده بود باده خوردن در شبایم اتفاق افتاده بود در نه عمر به دور با بانم اتفاق افتاده بود باده وصلش چشیدم از مذاق افتاده بود این چنین هم گاه گاه هم اتفاق افتاده بود کا و هم از روز ازل تا ازل اتفاق افتاده بود گر چه این صحبت مرا بسیار اتفاق افتاده بود

۳۰ نیم شب	از دل صد پاره ات آگه نیم شبلی دله شیشه دیدم که از بالای طاق افتاده بود	در شب
من که در سینه دله دارم و شیراچکنم غزل من نه آنم که به هر شیوه دل از دست دهم هست چل سال که بیوده نگه دشتمش ساغر باد و طرف چمن دلاله رخنه دل متاعی ست گر آن بایه کس نتوان داد بایه تقوی سی ساله فراهم شده است	میل بالاله رخان گزینم تاچه کنم لیک با آن نگه حوصله فرساید گر نه بر سنگ زخم شیشه تقوی کچم چون به اینها قدم کار بفرمایم را ننگان گریزد آن ترک بیایم ارغاشن به بخارے بدیم کچم	
۳۱ نیم شب	شاه و باد و طرف چمن و جوش بهار شبلیا خود تو بفرما که به اینها چه کنم	در شب
مرا گشت ست از اندیشه آزادست پنداری غزل ز بس که در سینه تالب گشت لبر ز شکایتها ز بس هر شیوه اش جوئے به یمن گر باشد ز بس که بیم افشا و صفای و در پره میگویم چنین که کوی او قاصد گران قاری آید	چنان بیابک خون یزد که جلا دست پاری نوائے کز لبم برخاست فریادست پاری نواز شهابے خاصش نیز بیدارست پاری حدیثیم از گل و نسرين و ششادست پاری ز دستش نامه ام در راه افتادست پاری	

دور نقش دام بر دوش و چشمش در کین سازی	بدان سامان همی آید که صیاد دست پنداری
بیا برب رنگ نظم خویش تن ناز و چنان شبلی	که در قلم معنی کنه استادست پنداری
جهان بزمیست بر تم گشته از آشوب خنیا غزل فریب لطف گفتار بت خود کام انازم تو ای قاصد باین شکر نشانیهای نری محبت را بود هر شیوه آئینه ز جان بازی حریفان از نگاه شوخ او را نگویند بدستند خیال بدست آن لعل نوشین ووش می بستم به سویم چون گذر افاد ووش آن ترک فتن را	هنوز آن چشم ز پرن بر سر کارست پنداری سخن میگوید از انکار و اقرارست پنداری به لبهای تو حرفه از لبی است پنداری به مژگان اشک خن منو بزارست پنداری که محفل سر سبز یک بزم خارست پنداری هنوزم لب ذوق آن شکر است پنداری بگفت این خسته جان جا گرفتارست پنداری
ز به جان بخشی آب و هوا می شبلی	طراز و خلق و نوشا و فرخارست پنداری
شب وصل است، حیا اگر بگذاری چه شود غزل تو بدین حسن توانگر چه زیان برداری از تو ناید گره بند قبادا کردن	یکدم تنگ در آغوش فشاری چه شود این دوسه بوسه اگر خود فشاری چه شود اگر این عقده به من باز پاری چه شود

گرچه صیدی چو منی لایق فراق نیست نال و گریه حریت جل خود کام تو نیست غنچه نشگفته جنون باخشن آورد به من بوسه با برب نوشین تو دامت مرا	گرچه عالم می لے ترک شکاری چه شود راست گفتمی که ازین گریه زاری چه شود تا دگر از اثر باد بهساری چه شود وام من هم به من ارباز سپاری چه شود
باز نگر	شلی دل زده را کار از انداز گذشت تو هم لے خواجیه حالش بگذاری چه شود
چرخ کین فتنه گری لے نو آغاز گرفت غزل سن در انجام ره عشق گرفت در پیش چه عجب جلوه که دوست اشودیده من ماجرای من سوا شده هر جا فاش است هر که یکبار نظر بر رخ خوب تو کشاد ابلی بود که مرغ دل من بم دادی دل به آن فوج حسن از ندیم خود چکنم مژده گوئید به زمان می آشام که باز روزگاری است کس این قصه پیاپی نسا	مگر این ضیوه از ان چشم منو ساز گرفت خنک آن کس که هم این شو نو آغاز گرفت که ز خاک درش این آینه پرداز گرفت البه آن بود که این واقعه را از گرفت بایدش دیده ز دیدار جهان باز گرفت این هوسا بود که از دست تو پرداز گرفت دل از صحبت پیران ریا ساز گرفت صحبت مختسب شهر من ساز گرفت گرچه صد بار فرو خواند و سر باز گرفت

خبرش نیست ز دامان ترغلو تیان	آن که او خروید به زمان نظر باز گرفت
پایل ۳۳	بزم را دید که از نغمه دوشینه تنی است شبلی آن زمزمه را باز از آغاز گرفت
هر جا که روی روشن تو جلوه ساز بود غزل هر جا حدیث فتنه ایام کرده ایم جانان زبان و لب نشود ز جهان شوق ما خود روزند پیچ یکے، سر برون نه برد لذت شناس زندی دستی نبوده است با خرخ سفلہ صحبت آن شوخ در گرفت چالاک و گرم آمد و دامن کشان گذشت آن شوخ را به صومعه ایچون گذر ققاد بنگر که چون به دام حوادث اسیر شد	هر فری را نظر به جمال تو باز بود روے سخن به آن گه فتنه ساز بود مارا امید باز نگه باے راز بود زان حلقه پاک در خم زلف از بود اینها گناه دیده مشوقه باز بود آن بوالهوس که در گردن و ناز بود کو فتنه دوست بوده و این تن ساز بود از بسکه دست شوق حریفان از بود یکبار عشق باے حقیقی مجاز بود آن دل که سایه پرور زلف از بود
پایل ۳۴	نگین مباش گر سخن از مدعانه رفت شبلی هنوز اول راز و نیاز بود

صوفی آن سر حقیقت که هویای کرد غزل	هر حدیثی که با کرد هم از نای کرد
پیکر آرای ازل طلعت نیبای ترا	نقش می بست هم از دوقی کشای کرد
بر گذرگاه چمن، عطر فروش سحری	بوی زلف تو بگفت داشت که نوا می کرد
ساقی آن می قبح بخت که از گزغش	هر نفس و ام می کرد و به مینامی کرد
فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود	گشت راز دیگر آن راز که انشای کرد
دوش رفیق و بدیدیم که طوطی به چمن	داستانها ز لب لعل شکر خامی کرد
آن گره با همه در کار حریفان انداخت	که زیچاک طرسه خود دای کرد
پیچ و تاب که دل غمزه در پنهان داشت	شکن طره گیسو تو پیدای کرد
به سیحان نفس آن لب اعجاز نغای	مرده رازنده می کرد و به عوی می کرد
مایه بر می هر دو جهان گشت آخر	فتنه های که قد و زلف تو بر پامی کرد
ساقی مصطفی عشق هر آن نکته که گفت	از ره گوش همیرفت و بدل جامی کرد

بذل شود	شلی از قامت و بالای تومی کرد سخن	یا اگر خود سخن، از عالم بالاسی کرد
بر سرفره غم چیز اگر می بالست غزل	پاره از دل و لخته ز جگر می بالست	گوینا عالم ازین نیز بتر می بالست

اگر می بزم ترا با همه هنگامه ناز روفت کوی تو زار باب تماشا نشود بخت بدین که به بهران تو بر سر زده ام	نال نیز آهنگ اثر می بایست بسمل چن در اهل گذری بایست دست شوقی که دران طوق کمری بایست
شبلی نامه سیه را به جزای علمش پایریند و صد اخاست که سری بایست	
عمری ست عشق و زرم کارم تمامیت چشم هر آنچه دیدنه هر دیده بست گرد شبهای بجز دیده ام و باز زنده ام می خواهد اینک در ره زندی قدم نهد چندان که رام تر شودم بدگمان شوم این پاس وضع باعث ناکامی من است	این باده بچخته نیز نشد گرچه خام نیست نظاره جمال تو عامست و عام نیست گویا که کار مرگ قضا را نظام نیست تراهد که هم به شیوه تقوی تمام نیست با آن که این نوازش خاص تمام نیست خوش عاشقی که در گردنکاف نام نیست
میان بزم	در بزم گاه ناز تو شبلی هنوز هم جدا داشته است لیکت آن احترام نیست
برق عشقی که مرا بر دل برتن زده بود	این همان ست که بر دای این نه بود
له اشارت است به واقعه زخم خوردن مصنف -	

تا قدم رنج کنی بهر تماشای چمن دیدم ای دوست که دادا من این بید هر زمان باز سر تاز بهر آورد چو شمع روزگاری شد و آن نشسته منوم بهرست	ابر بهر تو سر پرده به گلشن زده بود عشق آن چاک که در جامه دامن زده بود هر کرا تیغ غم عشق تو گردن زده بود یکدو ساغر به من آن دلبر رفن زده بود
بدر ۱۹	شبلی امروز به سجاده تقوی بنیشت آن که صد سال پیش در همین زده بود
چون آگهی که فرصت عهد شبابیت غزل پرسم که پیچ در دل تو هست جای من زاهد! شرب ناب جز انگور نیست مے را بقدر حوصله مرده دهند	مے خوردگر سخن ز غلاب ثوابیت هر چند داغم این که سخن را جوابیت رم خوردن تو این همه انگور آجیت با دشمن این همه کرم بے حسابیت
شبلی غنا گسسته مرد سوی بکبی	باینز با تو هم سفریم این شبابیت
چه غم از بند و زندان شاه رعنا کی غزل چه باشد حال اگر حرفی رضیون خواند آن خبر حدیثه دلکش از افسانه می خیزد	که از یک جلوه گلشن می تواند کرد زندان را که هم از پاره ساز و نامه خوانده عنوان را و گرا از سر گرفتیم قصه زلف پریشان را

به طلف ظاهرش شمعین بخون مجازان و من شام شب وصله ازو با آن درازی آرزو دادم غلط سازد شمار بوسه انگه ز سر گیرد دل هنگامه جو خمیازه بر خمیازه میرزد ز ذوق طبع شیلی من در اول دوزداستم	که سیکین ذوق نشناسد از شمع پنهان که یک یک شام حلقه لایق چنان نگه دار و خدا بر چشم بد آن طفل نادان بکارش نامزد فرما نگاه فتنه سامان که در آشوبگاه بگویی در بازو ایمان
بیا اینجا که هر سو کاروان کاروان بینی بتان آذری را دلبران شام و ایران	بیا اینجا که هر سو کاروان کاروان بینی بتان آذری را دلبران شام و ایران
ساقی مست چو سوی من مدحوش آید من برانم که کنار از همه عالم گیرم کام دل خواهی از ان نوبر خورده پیرم اصحا از محنت بی صرغم به کارم پسند مستی و عریه کار چو من نیست و نه حالیا یک نگه تا از ان ساده پس است عاشق آن نیست که هنگام تقاضا وصال این غزل اول فیض اثر بگویی است	غزل ساغر از کف بهندم که در دوش آید گر مرا یک صحنه شوخ در آغوش آید باش تا یک دست ساغر زده مدحوش آید من نه آنم که مرا پند تو در گوش آید چشم ساقی مست که تاراج گر مدحوش آید آن بود نیز که میباید در آغوش آید مهرش از بوسه زنی برب خاموش آید باش تا با ده این سیکه در جوش آید

مجموعه ۱۹	میرسد وقت که شبلی به بیتی با ده گسار از در صومعه تاسی کده همدوش آید	۱۹
امن نه مانند خلوتیان حجاز را منزل ذوقی دگر بود به تماشا که وصال لعل لبش اگر چه بکام شکر نه ریخت هرگز یکم به خوبی و رعنائی تو نیست بیچاره نکته دان ایامی عشق نیست ما از بلند و پست جهان در گذشته ایم هر چند جور نیز ز معشوق خوش بود چیزهای ز لطف نیز بیا میخت در تم آدر برم که کار از اندازه در گذشت ناز می کنی نه به اندازه می کنی ناوک بزد به غیر و مرا بر جگر نشست من خود نخواهم اینک به افتد حجاب را	دیدنی قنار دل خم زلفت دراز را چشمه بخواب در شده نیم باز را با ماسری ست آن نگه جان نواز را مادیده ایم کج کلهان سراز را ضایع مکن به غیر نگه ای راز را از بسکه دیده ایم نشیب و فراز را ما بنده ایم دلبر عاشق نواز را تا اعتدال داد می تند ناز را دست دراز گشته تا غوش باز را تیزی ز حد مبری طاقت گذار را قربان شوم خطای نگه ای ناز را اما چه چاره کلک حقیقت طراز را	۱۹
مجموعه ۱۹	بر چنین ز روی صفی که شبلی به سر خوشی	۱۹

از هم گسست نلک گهرهای راز را

وقت سحر که حارض او بے نقاب بود بزم شراب و شاهزنگین بانگ نه اندازه دان حوصله هر کسی است دوست شب بود و صد هزار تماشای دلفریب با چشم شرنگین تو کارے ندا شستم ناز غرور حسن نه دادش اجازت بیدار کرده است بهر گوشه فتنه آخر از ان لبان می آلود چاره چست	در بزمش اول آن که رسید آفتاب بود این حرفی از فناء عهد شباب بود با دیگران به لطف و به مادی عتاب بود صبح از کرانه سرزد و دیدم که خواب بود مار اسخن به غمزه حاضر جواب بود ورنه سوال بوسه مار اجواب بود با آن که چشم سحر طرازش خواب بود گیرم که از شراب میم اجتناب بود
--	---

شبلی خراب کرده چشم خراب است تو در گمان که مستی او از شراب بود	باز
--	-----

رستم بهر سود و زیان کرده ایم ما بی حاصلی نگر که به این وری از رخس نام خدای برب و ذوقم نه و هر سز زیان و سود نشد هیچ آشکار	در کعبه نیز یادستان کرده ایم ما صد جالے بهر بوشه نشان کرده ایم ما از بسکه یاد نام بستان کرده ایم ما صد بار اگر چه سود و زیان کرده ایم ما
--	---

جان را به راه مهر و وفا می تو باختیم از نام نیک در ره زندگی و عاشقی	دین کار را هم از ته جان کرده ایم ما از ما پیرس تا چه زیان کرده ایم ما
بزم ۱۹	شبلی سخن اگر چه ز راهِ فسانه بود لحظه زرا از نیز بسیار کرده ایم ما
من که خود را فارغ از کبر و مسلمان کرده ام خیال زین از زندگی من تا بقوی غرق هست ز مهر و زندگی را بهم کردن چه مشکل کار بود رسم و آئین هم آغوشی نمی آمم که چیست این هم آخر فیض شهبای دراز، بجز بود ذوق با بزم هم از روی عتاب آلود او دین و دنیای اگر می داری ایدل مفتست چسیده ام بر هر سر نوک مژه لحظه ز دل شام وصلش هست و این گشته از نیم صبح در سخن با خاک بیان مهند می سخن مرا	انچه چشم کافرش فرو نه است آن کرده ام بر ملا هم کردم، اکنون انچه پنهان کرده ام سعی با انیکم کاین مشکل آسان کرده ام دست گستاخ انچه فرو نه است من آن کرده ام گر شمار حلقه های لطف پیچان کرده ام آتش بوده است دین بر خود گلستان کرده ام یاری گوید که نرغ بوسه از زان کرده ام باز کار گر گریه را نخته به سلمان کرده ام آفتاب آوردم و در خانه پنهان کرده ام هی چه می دانی که این فن را چه مان کرده ام
بزم ۲۰	یاری پر سید شبلی را که چون برباد رفت

مُشت خاکِ درمِ پیش پریشان کرده ام

شب که تیر ناله من بک سامان کرده بود غزل
 با و صبح امروز از هر کوچه مشک نشان گذشت
 ترک چشمش چون پے تاراج دین آمدن
 در چمن رفتی و از بهر نشا را آورد باز
 رفتم و در سایه زلفش پناه آورده ام
 غازه هر رنگی که بروی دل فروز تو بست
 روی رنگین ترا دید و بروی خاک نخت
 طالع رسوائی مجنون بلند افتاده است
 از دم باد بهاری شاہد رعنائی باغ
 لعل معجز کیش او طرح مسلمانی نهاد
 سنبستان می دما از حبیب آغوشم هنوز
 در و صالم نیز کام دل از و حاصل نشد

رخنه باد رنگبند گردون گردان کرده بود
 شب که مشاطه زلفش پریشان کرده بود
 تا خبر گیری حرم را کا فرستان کرده بود
 غنچه گل رنگ بوی را که پنهان کرده بود
 زان تم باے که برین شام هجران کرده بود
 هم ز رنگ می گلگون تو سامان کرده بود
 آن همه گلهای گنجین خود بدان کرده بود
 ورنه شیدا می تو هم صد کار زیان کرده بود
 از گل و غنچه طراز حبیب دامان کرده بود
 در چشمش رخنه باد کارایمان کرده بود
 زلف مشکین در بیم روزی پریشان کرده بود
 بسکه شرم خویش را بر خود نگهبان کرده بود

شیوه زندگی چنان شبی آب رنگ کرد
 گویا زین پیش هم کرد و به سامان کرده بود

درم پیش

۱۰

آن دل که خاک گشته آن که گزار بود شرم از لب تو مهر چیا گرچه بر داشت آن شب سوار ناز رسید وز ره گذشت آغوش شوق و دیده گستاخ و دست شمع از بسکه تند بود می خوش گوار وصل صوفی که پیش خلوتیان جلوه می فروخت با آن که جام وصل پیای کشیده ایم	غزل سر جویش باده کن روزگار بود شادم بی این که غمزه پرفتن بکار بود مارا جهان نگه بر تو نظر آرد بود در وصل هر چه بود ز من خود بکار بود مستی برون ز حوصله خستیار بود پنهان به بزم باده مانیز یار بود خمیازه های شوق همان برقرار بود
۱۰ دهم	شبلی بیای که گرمی بازار بیتی اسال نیز هست به رنگی که پار بود
چون در طریق عشق گذر می کنیم ما غزل در راه عشق پیر و پیشینیان ایم واعظ ز ما مرج که ترک می و سرود از ما بدار دست که زدی و عاشقی ضایع ساز خرقه مستوری مرا	از روی شوق پائے ز سر می کنیم ما این شیوه را به طرز دگر می کنیم ما شب گر نکرده ایم سحر می کنیم ما صد بار کرده ایم و دگر می کنیم ما وقتی رسد که باز به بر می کنیم ما
دوم	شبلی ز فیض تربیت طبع نکته سخ چند

برودیم قطره و گهرے کنسیم ما

راہی دگر بغیر حریم حرم نداشت دلہا ز بس ربود اگران بار گشت است عرض ستاع عشق نمودیم ما غیر وحشی دلم به سایہ زلف دراز او صد چشمہ جوش می زند اکنون دیدہ ام مارا به بوسہ لے شکر ریز بر نواخت از غمرہ تو بسکہ جهان بر ہم اوفتاد دل ما به ہر کہ عرضہ نمودیم در جهان ما سجدہ نہی از تو ای کج کلاہ ناز	غزل زاہد کہ تاب جلوہ روی صنم نداشت زین پیش ورنہ زلف تو این باخیم نداشت مسکین ہنوز مایہ یک چشم نم نداشت آسود آن چنان کہ دگر ہیج رم نداشت روزے کہ باتو بودہ ام این خانہ نم نداشت تا کس نگویہ این کہ طریق کرم نداشت یک کس ازین میان دل ایمان ہم نداشت انصاف داد و گفت کہ این جام جم نداشت زان عہد بردہ ایم کہ این قبلہ خم نداشت
---	---

شبلی ز خیل زمرہ سنجان چشم گرفت
با آن کہ بیج گونه ز خیل و چشم نداشت

۱۰۰ نم ۱۹

۱۰۰

تا چہرہ زیبایے تو ام در نظر افتاد دجیب و گریبان چمن عطر نشان است عمرے شد و یک روز نیفتاد بہ دتم	غزل کیا رہ اساس خرد و ہوش بر افتاد بوے تو کہ در دست نسیم سحر افتاد از بس کہ ہر ام روز بہ روز دگر افتاد
---	---

باینده آن بادو تندیم که از جوش زمین پس هفت تیر تو هم تیر تو باشد لے باد صبا مشک نشان بازگشتی رد کرده متاعی ست به باز از محبت	از شیشه بروی جیت زمینا بد را قتاد پیکان تو از بسکه یکے بردگر افتاد گویا که گذار تو دران رگه را قتاد آن داغ که لے لاله ترا در جگر افتاد
بیم تر	شلی در گراز صومعه درے که ده آمد این غفله تازه به مے خانه در افتاد
آن شوخ چو از پرده به کیار برآمد لب تشنه زخم ست همان این دلیاب ممنون سبک پائی مرگم که شب هجر امج قد و بالای دل افروز تو نازم تر دستی آن غمزه چالاک توان دید	هنگامه مستوری زاهد بسر آمد کان ناوک پیشین که زدی بر جگر آمد از صبح دمیسان قدس پیشتر آمد کاب دم شمشیر ترا تا کمر آمد تیرے که بز دیر دگر بر اثر آمد
۱۸	لب را از بنیم نتوانست که داشت دقتی که ز جان دادن شلی خبر آمد
لے که صد طعنه به خورشید و بر اختر زده اگر چه لعل لب جان بخش تو حاشا زده است آن لاله	باز بر قتل که دامن به کمر بر زده میتوان یافت چشم تو که ساغر زده

من ندانم که سراز تیغ جفا بردارم آنچه از گرمی بهنگامه محشر گفتند یاد باوت که شبی ز اول شب تا دم صبح از دو چشم تو عیان است که در بزم طرب هیچ نقشی به مراد دل عاشق نیست	اگر چه صد مرتبه چون شمع مرا سوزده هست بزمی که تو صد بار بهم برده مست بودی و بجا با ده و ساغر زده زده جام می ناب و مکر زده مگر آن نقش که از بوسه لب بر زده
بوی زخم از دل آغشته به خون می آید شلیک سینه مگر بروم خنجر زده	چنان نه شهرت عشق تو بر زبان انداخت حدیث لطف تو با غیر شک داشت ترا کدام جفا پیشه این سبق آموخت نقان که آن همه گنجینه های راز مرا فریب زر گس مست و کرشمه ساقی پدید غیبت میانش مگر که شاعر صنع
به پارسائی شلیک هم اعتماد نماند نگاه شوخ تو، تا فتنه در جهان انداخت	که پرده بر رخ این کار می توان انداخت و لم مرا ز ره رشک در گمان انداخت که چشم لطف به عالم نمی توان انداخت غمت ز سینه بر دل داد و بر زبان انداخت مرا به پیروی شیده مغال انداخت ز مصرع قدا و حرفی از میان انداخت

لے آن کہ ہی گوئی کز از خبر دارم ای دوست پیرس ازین ستم و رنج تو ای رنگ ز رخ جسته یک خط توقفت کن تا سال دگر خوابد شد زین بے و مطرب روئے چنین روی شایان نقض نیست رندی وسیه کاری مستی و نظریازی یک دیده حیرانی از هستی من بانیست ای متکلف کعبه این جلوه فرشتی نیست از زهر دروغ خود بفریفتی ام خلقی	اندیشه خامی هست من تیر به سر دارم اکنون که من بیدل سودا دگر دارم من نیز ازین عالم آهنگ سفر دارم این خرقة مستوری کمال به بر دارم بگذار که این پرده از روی تو بردارم زین گونه اگر خواهی بسیار بنزدارم وان نیز نمی خواهم کز روی تو بردارم من هم به سر کوئے که گاه گذر دارم ای دوست چه می پرستی تلن چو بنزدارم
۱۸۰۰ ۱۸۰۰	لے شبلی نعمانی این پرده در می از بیت اینها که ز خود گفتی من نیز بنزدارم
از همه کار جهان دل می و مستی بگزید بسجده شتم از جمله اسباب و ریح تا به این مایه شب هجر نبوده هست دراز وام داران همه از و ام برستند و نهوز	بعد عمری که در اندیشه هر کار بماند رفت از یادم و در خانه خمار بماند چرخ گردنده همانا که زرقار بماند بوسه با و ام مرا بر رخ دلدار بماند

حادث از کشمش بدو قبول آنرا دست مژده گوئید مقلان درمی کده را	یوسف آن نیست که در بند خریدار بماند کز جهان رستم و از حسن و وزیر بماند
مرغ در دام بپنجا و بدرجست و بر مید دل همان در خم زلفت تو گرفتار بماند	
روادی سلوک خود دور بوده ایم ^{خزل} هر جملوه مرا نتواند فریب داد از ما بگیر درس سنون ریا که ما مجوییم ز دولت و صلت هم از من است ما را به نقل و باوه دے احتیاج نیست معذورم ارب به فهم نیاید حدیث دست	یعنی که مست باد و منصلو بوده ایم پروانه چرخ سطرور بوده ایم عمرے دراز زاهد و مستور بوده ایم تولس قریب بودی و مادور بوده ایم ما از نگاه مست تو مخمور بوده ایم در نیم راز از او قدے دور بوده ایم
پیشانی ^{۱۸۸} مست از مے شیانہ پر زور بوه ایم	بشلی ^{۱۸۸} مست از مے شیانہ پر زور بوه ایم
ای اجل گریه من خسته تراکاری ^{خزل} بوسه لعل تو گویند به جان می ارزو از حفا بے غم بجز تو از جان رستم	اندکے باش کنر و عدہ دیداری گر بهای کنی ای دوست باخیز ایست این بود اندک از آن جمله که بسیاری است

به خریداری یک بوسه تنی مایه نیم کار باطره گیسوی بتان افتاده است از سراپای تنم آنچه بجا مانده به سحر	اینکه پرسی دل دین به تو هست داری است ما چه دانیم که تسبیحی در تازی هست دیده هست و در وحشت دیداری است
بزم لاله	شبلی شیفته در حلقه سوزندگان گویا قافله و قافله سالاری هست
طوطی گلشن عشقم شکر افشان نشوم خنک آن کس که به ذوق نظری قانع	غزل تان آینه ردی تو مقابل دارم دای بر من که جسد اندیشه پل دارم
کوشش ناخن تدبیر چه سودم بخشد من که یک شسته و صد عقده شکل دارم	
به هر معنی متاع عقل دلتش ابر افتاده است به دست آوردن دل یک صبر بی طعنه میخوا دلم از شیوه این گلرخان از جانی آمد خلیل آهنگ طرح کعبه اسلامیان دارد	غزل به غارت برد باز آن چشم رفیق کاروان را به این کمتر بهمان از کف مدخس گران را فلک بگماشت بر من لربای نکته داران را بدست آورده ام من نیز خال آستان را
حدیث عشق خوش بود و است بلی حشرک کرده است شنیدن می توان زین حرف زنگین دستان را	

دوش مستی خبر آورد که در عرصه شتر غزل دیدم ام در حرم آینه زیبا صنی زور سرخه تر گان تو گرا این باشد حاشقان را همه آئین عمل خواهد گشت	گفتگو از خم و میسنا و سبو خواهد بود که اگر چون تو کسی هست هم خواهد بود ای بسا خرده که محتاج رفو خواهد بود ماجرای که میان من و تو خواهد بود
مست فرستی میان تو تن زار مرا در بود نیز، همین یک سر سو خواهد بود	
نوازشهای او رسمی بود دانسته ام اما تو بهم دانی که کارش تا کی خواهد کشید آخر بیایان آشکارا گفتم این قنبر چنان هم غزل نگه کاش آنقدر سر پای کرستی از تماشایش بذر آموزی لطف آشکارای تبار نامزم حدیثی اینچنین کم اتفاق افتاده دران دو دلی بودن من و سخت بریده سالک را مده از دست خود رنگین لای پیچ و مشلی را	تنگ ظرفی چون آبگو آرمی نیز لبش باشد مباد آن که ششلی را به صلیت سترس باشد که شوخی نکته دانی بر دامن عقل ایان هم غزل که می آمد بکار ما دل در روز هجران هم که دل فانی نشد با آن نوازشهای پنهان هم که من نادان و ناصح هست نادان تر نادان هم که نخواهم گفت با او شکوه ایام هجران هم خجل هستم ز کفر خود که دارد بوی ایمان هم تو شاه حسنی و در کار داری کی غنایان هم فقط

بوی گل.

۱۲۳۴



۱۲۳۴

نوی گل

لغینے

غزلہا رہے جید

از

بشلی نعمانی

ایقام خاکسار رشید احمد

درمطبع ہی بلی گل سن ۱۴۰۹

بوی گل

لیکھنے

نغمہ ساز ہے جید

از

شبلی نعمانی

باہتمام خاکسار رشیدیہ

در مطبعہ عیسیٰ گیلانی طبع

اکتوبر ۱۹۰۸ء

یک فرزند قدم مژده سرای آید رفت از شهر بدایں که بهارانِ حین گویا یوسف گم گشته بکنعان آید رفتش گرچه بکام دل اجاب نبو خوشی بشن بهان لطف و صفا هست که بود شیشه دای دل عشاق بچینید را مزید آب به خاک سر را شش کیں کا دیدہ و دل بہر دکان تماشا چیند ابرو ان خنجر و کیسوی منہ بہشتہ کند	کز سفر پارس سفر کردہ مامی آید آنداں گونه کہ در بانغ صبا می آید یا نگار مینی سوئے صبا می آید چوں بیاد بہ مراد دل مامی آید ہم بدایں قاعدہ مهر و وفا می آید کہ گزندش سدا در تہ پامی آید شبنوہ ہست کہ از دیدہ مامی آید کاں تماشا کہ حسن وادامی آید ترک شوخی ہست ز میران و غامی آید
---	---

بوی جانی که مشام دل بجان تازه کند هر کجای می گذرد عطر نشان می گذرد آمد و از دل ماصبر و سکون می طلبد کارز اندازد مبرائے نگه شوق که ای دعای سحر از چرخ فردا کنی	میتوان یافت کز آن بندبست می آید هر نیستی که از آن زلف و تامل می آید شاه بنگر که به آئین گدای می آید روی نهفت و به آئین حیا می آید کال که میخواستی اورا بدست می آید
شلی غمزه آورد دل و دین نشانی غیر ازین چسبیت که از دست گدای می آید	
۱۴- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
بر پست از لب کفام خوش است عشق را اول و آخر بود مدعی از هوس خام گذشت باد را نیست خود از لعل گزیر من نیز ز دیو جوی سند حرم بر دمی بنده خوشیم میخوای بوسه بطلبش نیست نکرده است نتوان پرده به خورشید کشید	نه همی بوسه که دشنام خوش است هم در آغاز و هم انجام خوش است گر به بایز نشد رام خوش است بوسه از پس دشنام خوش است دین حکایت لب جام خوش است که مرا نیستیم نام خوش است گر چای شیوه را برام خوش است روی او جلوه که عام خوش است

بگذر از باد و به پیری شبلی ز آنکه هر کار به بهنگام خوش است	
۱۵- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
لکھنؤ	
ہر شیوہ اش بلائی دل دروند بود با آن کہ کار با صمیمی خود پسند بود یک نیزہ قدمتہ طرازش بلند بود یارب کدام جاہل اس رشتہ بند بود پر دامن کہ نزع متاع تو چہند بود سہلایہ کہ بود دل مستمند بود	آں شوخ بس کہ پایہ حسنش بلند بود در شوق، پاس گرمی نازش بجا آمد سبخیہ ایم منتہ محشر بہت قش ہرگز حدیث شوق بہ پایاں نیامدہ است می بینم اس کہ تمیت دل تا کجا کشد تو یک نگاہ ناز زیاں کردی و مرا
شبلی ز بہادرست کہ ذوق سخن نہاند شکر فشانیم ہر زان شوخند بود	
۱۶- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
پیام بندہ بہ آں خاک آستان برسا و گر نہ لطف بفرماے و را گاہ برسا	نسیم صبح بیا۔ راستے بہ جان برسا متاع جان و ہم ار پاسے مژدمی خواہی

رواست دار درنگ و ہمیں ماں بسا اگر نہ جملہ تو اس نچسے تو اس برس چناں کہ باتو بگویم تو ہم چپاں برس درد و گوی و دو عایم زماں زماں برس بیا و تیرے من بہ آسماں برس	دور شوق شکیبائی تو اندیشہ حدیث شوق نہ چنداں کہ دریاں گنجد تقصیر نے مکن از پیش خود و در چیزے ہستمانہ او سر نہ وزر وے ادب بگو کہ طبع و عد بائے پے پے
سلام شوق و منت از بند لعلی پرسا کنان در او گیاں گیاں برس	
۱۷- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
محبت راہمین یک وام بر لب داوا کروم در بے از زود کاریا کہ مکتوب تو واکروم غلط کروم کہ آں بے مہر را در دشتا کروم بہ اودل را سپہون خواہم اول بہا کروم کہ تو بند قبار عقدہ ہرستی و واکروم بہ ایں شادوم کہ آں بہت را پناہم شاکروم	دل میں باختم زین پیش و کنون جاں فدا کروم تماشا داشت آں ہنگامہ خیر ہیا می یا خیال خام چمن بائے یاراں عالمے دار متاعی گرد بست آساں قدہ قدر نمیدار شب وصلے و شغلے یچنین صدرہ صبریم نیم در بند پناہ اول کارست میلدانی
مے مید آتم با خویش نغمہ کیا کروم	دل افسردہ را امین عشق آہو ختم کی
۱۷- ہاکون سوں کرتا۔ ۱۲	

۱۷- اکتوبر ۱۹۰۸ء

زجاں گزشتہ دہائے بہرینے آید اگرچہ پایہ بلند بہت پارسائی را زلسکہ از ہمہ سود کشا کشا افتاد بہت فراق و ہجر و یار خوشے بود کہ در دل اربہست افتاد زار و خواہن بہ جاں سپردن من دیر اگر بود است جدا زد دوست شب تابان چناں چلقہ آغوشم آں نگار آمد	کہ نیست درم آں بت بہر نمی آید ولے زفتہ چشم تو بر نمی آید خدا نگہ ناز و دل تاج گری آید پس از گذشتن شب ہم سحر نمی آید کہ ایں تساع، بکار و گری نمی آید کہ یار زود و تر از زود و تر نمی آید کہ کار عارض او از سحر نمی آید کہ مہ بہ مالہ ازیں خوب تر نمی آید
---	--

بہ خوارے کہ زکوٰۃ تو رفت لغمانی

اگماں برم کہ ازیں پس و گری نمی آید

۱۸- اکتوبر ۱۹۰۸ء

بہ حال خستہ اش رحنی تو اں کرد رد و این تقویٰ نیز نہ نیست نصیب عشق از رویش ہیں بود	کہ در گم عشق را بے خان ماں کرد اگر کارے نباشدے تو اں کرد کہ جائے بوسہ را یک نشان کرد
---	--

پرندی نامہ سیکوڑاں پرورد
 ہر وقت جاں سپردن گفتیہ
 دل از خوباں گرفتنی خوب کے دی
 محبت پایہ بالا برد، دل را
 بوسہ دل نوازی کردی اسی
 چوتہا با حریفان بر نیامد
 نعمت از دیدہ اہل نظر ہم
 اگر گشتگی بختم این است
 مرا از پیر گردوں، شکوہ نیت
 بلم چون خواست یا او شخ لفت
 بگو بسامے، کامور شرفن
 مرا از عشق خود، خود می کنند
 بر یاراں ہمینی تیہ قضا را
 جنوں یارندی و شاہ پرستی

کہ دل را ہر چہ من گفتم ہاں کرد
 نکردم عشق، اما سے تو اں کرد
 ولکن ذوق و عرفاں زیاں کرد
 زینے را ربود و آسمان کرد
 ازیں ہم خوب تر کار تو اں کرد
 حیار خواند و بر خود پاساں کرد
 جمالے انچیس را نگاں کرد
 زمیں را میتواند آسمان کرد
 کہ با من ہر چہ کرد، اں جواں کرد
 نگہ را نیسرا خود ہم زباں کرد
 ترا می باید از چشم فلان کرد
 چنانش چرخ بر من مہرباں کرد
 نگاہ شوق او خاطر نشاں کرد
 یکے زیں کار با آخر تو اں کرد

ہماں کرد از سخن در بند شہلی
 کہ صاحب رسوا و اصفہاں کرد

۲۰- اکتوبر ۱۹۰۸ء

کسب این فن ہزاراں نگرین تال کہ دم شکر از دیکہ ہم ایس کردم و ہم آں کردم آں ہمہ راز کہ عمرے ز تو پنہاں کردم آہ ازان تقویٰ سی کہ لقصاں کردم شیوہ ہائے کہ ہم العمل تو پنہاں کردم کہ من از نام نکو بسر تو نقصاں کردم انہ آں نگرین می خوارہ بگفت آں کردم مشکلے بعد کہ بزخشتن آں کردم زلفت آں ساں کہ بفرمودہاں ساں کردم سرمدہ در رہ گند باد پریشاں کردم	من اگر پروی شیوہ مستان کردم کاہستوری و شاہ طلبی ہر دو خوش است انکہ گرم در آخر ہمہ پیدا ہو تو گفت بائی و بادہ، پیراں سرم کلافتاد بوسہ بے ادبم با تو بہستی کردہ بہت چشم لطف از تو بہ اندازہ آں می دارم زاں بہ سرستی و رندی شدہ آوازہ کن جاں سپردم بہ فراق تو و از غم رستم در جنوں نیز ز اندازہ و آئیں نشدم ہر عیائے کہ ز کوئے تو بچین نہ گوید
---	--

شبلی ایس فن نہ بہ این شیوہ و این لہجہ است
پیش ازین کالبدے بود کہ من جاں کردم

۲۱- اکتوبر ۱۹۰۸ء

حکایت من و او گچہ راز پنہاں بود	بے نمائندہ کہ ایس حرف و داستان گرد
--	---

زینش عشق ہنوز، ارغے بری ذوقی بلند پایگی خاک کشتگان این است پیش عیبر بش نام تہ سباز مدہ اگر چه زخم دلم، روئے در ہی آورد زب کہ نام تو از ذوق بر لبم گذرد، اگر بہ وصل تو مستانہ جو شیم این است بہ این صفت، لب لبرئی کہ عاشق	بباش، تا قدرے آشنای جاں گردد کہ بانسیم رہ دوست ہم عباں گردد روا دادر کہ خود سود من زیاں گردد زخندہ نکمین، باز ہم چنباں گردد عجب نباشد اگر غیسر بد گماں گردد متلع بوسہ بر تسم کہ را نگاں گردد حدیث دوست بذو تے کہ درواں گردد
بہینہ گوہر فطرت کہ نام او سبلی است چنباں یکن کر دست تو را نگاں گردد	
۲۲۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء	
چشمش بہ سوئے ناگہ نامت ام کرد ذوق نظر بہ لذت کاوش نمی رسد صد بار در جریم چمن پیش روئے تو ہنگامہ حسام تو شوریدہ وقت کرد شیرینی لبش بہ شکر غوطہ میدہد آہ از کہ شمعہ تو کہ لتیلیم نازد	ساقی بہ جام ریحیت، می نارسیدہ را داعم ازیں کہ دل نتواں کرد ویدہ را گلچیں بہ خاک ریحیت گل تازہ چیدہ را آن کشتگان مرگ بہ خاک آرمیدہ را و شمام ہائے تلخ مکر رشیدہ را آن چشم ہائے مست بہ خواب آرمیدہ را

شبلی اگر حریف و نظر باز بودہ است
عیش کن کہ در نتوان بست و یورا

۲۲- اکتوبر ۱۹۰۸ء

روزگارے ست کہ فرزند و دانا بودم عشق ہر چند بہ دست تو پیچم بفروخت خون دل میخورم از حسرت ناکردہ کنو بہ شکر خندہ لطف تو تلی تشوم ہندوئے زلف تو چوں کفر فروشی بکند	حالی مصلحت آن است کہ واں بہم قیمت کم کن ازین نیست کہ ارزاں بہم آن شد لے دوست کہ از کردہ پشیاں بہم من کہ خورده آن غمزه ہنپاں بہم تنگ من باشد اگرزاں کہ مسلمان بہم
--	--

۲۳- اکتوبر ۱۹۰۸ء

من نہ ازار باب تقویٰ بودہ ام از جمالش ہم نہ بردم بہرہ بہج از صبر و سکون ، با من نہ بود قیس ز آئین جسنوں بیگنا نہ بود ترک دانش کردم و نادان شدم با خیالش بس کہ بودم ہمیش	بامی دئے بودہ ام بل بودہ ام آن قدر محو تماشا بودہ ام در سابق دوست تنہا بودم روزگارے ہم بہ صحبہ بودم ایں جیل آن کہ دانا بودہ ام گوئی یاد دوست حربا بودم
--	---

بوسہ ہائے بروم از روی ولش	در شب صلیب بعینہ ابو ام
وام وصل او ادا ناگشتہ ماند	اگر چه غمے در قفا صبا ابو ام
ہم زین فیض شبلی لہجائی است ایں کہ در ہر شیوہ بخت ابو ام	
۲۳- اکتوبر ۱۹۰۶ء	
ایں چنین اگر دین دعوی نہ فراز و چکند	بہی گمہاں بر خویش نثار و چکند
غیر ازین ہیج متاعے نبود عاشق	در قمار تول ازین نہ باز و چکند
عاشق از بسکہ پیش تو ز تو محروم است	دست اگر سوی تو گتخ نہ یاد و چکند
بسکہ در دین از اندازہ در مان بگشت	چارہ گر با من بچارہ چساز و چکند
شبلی دل زوہ در وادی غم دیرید گرم اگر در رہ عشق تو نہ تاز و چکند	
۲۴- اکتوبر ۱۹۰۶ء	
آں شوخ را بہن میراں پرسن جو نہ ماند	یعنی گل مراد مرانگ و بو نہ ماند
دل ہوا دای طاعت حق حیلہ جو نہ	عندرم بہنہ کہ بادہ بت کرد وضو نہ
افسوس طرازی نگہ ناز را بہین	چیزے بہ من نہ گفت مرا گفتگو نہ

بنگر بخت فطرتی صوفیان در هر چند آن نوازش ظاهر عیاں بخت در دهر چشم باده گز تو میفرودش	چیزی نیافتد سر بخت جویت پدیدست ای که آن دس پش چوین خوں میخورد که میکده را بزم نما
شبلی هر آنچه داشت دل بربان کند گویند که کار با حسن تمند خوند	
۲۴- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
دل شاز غم غماز می بایست کرد کار عشق خوب رویاں نامکر شیوه است در بدستماں اگر زاهد زبان بکشوده بود خود پرستی با ترا ای دل پر عشق آواره است باز غم است قیس تنهامی کشی از ان طبع شیوه دل بردن آسان نیست چشمش بگویی دل تمنا کرد از یک بوسه و خال نشست دل که زنگ آلود و انش شد شری عشق عمر آخر گشت ، و در اندیشه ام کس کاردا اگر سپاه حسن را فرمان خوں کردی و بی	آنچه آخر کردم از آغاز می بایست کرد گر چه صدره کردی ای دل با نیتی است کرد هم مان شیشه می بازی بایست کرد پر خطر کاری است بابا ، رانی بایست کرد در چرخ کار بے مرا انبازی بایست کرد پیروی غم غمنازی می بایست کرد من بر انم کس سوا لش بازی بایست کرد اول این آئینه را پر دازی بایست کرد هم به حسن و این دگر آغاز می بایست کرد ابتدا از ان غم غمنازی بایست کرد

بندگی حاقط شیرازی بہت کرد	گر خداوندی ہوس داری در قلم سخن
ماہ این مستدراز تو رخنہ نیستی اندر سخن شبلیا سحرست این اعجازی بہت کرد	
۲۵- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
این قیاس از رنگین کاری بہت کرد محاسبان نیز با خودیاری بہت کرد کسب این فن از نگاہی بہت کرد انتظار گرے بازاری بہت کرد انچہ با ما کرد، با نعیساری بہت کرد انچہ با گل کردہ، با خساری بہت کرد اندیس فن رحمت بسیاری بہت کرد زیں دو کار دلنشیں یک کاری بہت کرد شرح اسرار نہاں بروداری بہت کرد خود ترا، ای جذبہ الٰہی بہت کرد تلخی نوشنام ہم در کاری بہت کرد	شاہانِ بلخ در ہجر تو ز آفتادہ اند شرط بہت نیست تنہا بادہ و ساغز و ن ناتمامی ہائے سحر سامی، دانی چیست؟ از غلط فہمی، یوسف در تماشا گاہ حسن، شیوہ ہائے دلبری را خو بی داندلی بابدان سچشم لطف ای چمن پر لری صنع ہر کسے چوں سبب، میدان یا لمر ویت جامے یا بوسہ لعل شراب لوداد، منبر و محراب، درس عشق را شائستہیت نامہ و قاصد حریف آں بت و کانمست بوسہ تنہا نشکند، حمیہ ازہ ذوق را
من برا تم کہیں نہیں، صد کاری بہت کرد	اگر سبلی در جہان جفا شقہ کاری کرد

۲۵- اکتوبر ۱۹۰۸ء

ہرزہ زشت عیارم ہماں بجا بنگر و ج شیوہ بیگانی کرد	گویا نیم دست چساکم گز کرد در کوئے یارفت و مرا ہم خبر نکرد
دشمن بہ حال شبلی دل خستہ خوں رست واں و دست میں کہ خود مرثہ نیز تر نکرد	

۲۶- اکتوبر ۱۹۰۸ء

بارہا گفتہ ام و حاجت تکرار نہاند چشم مست تو چنان وہ کشتی از درج آنقدر محو تماشای جالش بودم شو جس تو چنان بزم چمن بر بزم زد کار آن گیس مستانہ بودا یکس بہن یا جگر کاوی آن نشتر ترگاں کہ شد فتہ حسن تو از لبکہ جہان بر بزم زد ہویم خود کا بی خلق از تو چنان عام شدہ	کہ مرا جز بی و بادہ سرو کار نہاند کہ مرا نیز دریں مسئلہ کار نہاند کہ نگاہ را خبر از لذت دیدار نہاند نالہ بلبل شوریدہ بہ پنجبار نہاند نگھے کرد کہ با بیسج کسم کار نہاند یا کہ خود زخم مرالذست از زار نہاند در میاں تفرقہ سبزو زار نہاند کہ دریں عہد کہیہ را بہ کسے کار نہاند
گرچہ شبلی بہن آن لطف عیانتش بہت	الغافلے کہ ہنسان بود ز اعیار نہاند

۲۷- اکتوبر ۱۹۰۸ء

بسکہ رنجوری اس حسرتہ زتیار گذشت بسکہ از مستی چشم تو جہاں شد سرست شیوہ نالہ بیاں پایہ رساندم کہ نول حسن جاں پرور اور روز بروز افزون نہمیں دل کہ ہم از خویش نناں دہشتہ ام بے سبب نیست کہ یوسف بہا افتادہ آہ جاں سود کہ در پینہ ام تمام گرفت داد ازیں پیری بے صرفہ کہ ناخواندہ رسید	عیسی آخر نہ علاج دل بہار گذشت محتسب بے خبر از خانہ خسار گذشت کار از حوصلہ مرغ گرفتار گذشت تا بہ جائے کہ از اندازہ گفتار گذشت ماہر اے کہ میان من و آن مایہ گذشت دلبر شوخ من از خانہ بہ بازار گذشت ایں بہاں است کہ از گنبدہ دوار گذشت آہ از اں عہد جوانی کہ بہ ناچار گذشت
---	--

بسکہ سود از دہ رندی روز افزونم
شبلیا سستی ہمال من از پار گذشت

۲۷- اکتوبر ۱۹۰۸ء

مرا کہ در رہ عشق تو اولی گام است	امید بوسہ اگر است ہم نہ پیام است
----------------------------------	----------------------------------

۱- از بہا افتادن، مزخ کا گٹ جانا۔

۲۷- کتوبر ۱۹۰۸ء

شیخ شریک دہ و ساغر گشتہ است داعم ایں کہ رندی و مستیم بنو ذوق حدیث عشق توان کین سخن آلودگی نہ دامن پاکان نہیں یک کس نبودہ است کہ برین لاش خست	یعنی کہ از طریق ریاضت گشتہ است بالقوی گشتہ برابر گشتہ است صد بار گفتہ ایم و مگو گشتہ است گوہر در آب لودی ریختہ است وال شوخ دیدہ راثرہ تر گشتہ است
شبلی طمع مدار کہ از عشق و اشوم زیں راہ کہ رفت و گر برگشتہ است	
۲۸- کتوبر ۱۹۰۸ء	
بامابہر معالہ بدگساں نبو از لذت اولے تم میتوان نجات می گوئیم کہ دل بہ کسے دادہ مگر حاجت چا و سازی دشمن جوہ ایم بامصلح ساز لیکن همچو دوش جانے بہ بوسہ باخہ و سود کردہ ایم	خوش بوداں کہ از محبت عیال نبو کیں چو راز تو بودہ وارستہاں نبو مارا بکمتہ دانی ادا میں گساں نبو بااں کہ دوست نیزہ نامہاں نبو کرتیرہاں غم دیکے در کماں نبو ویش می کشید بجا ہم گر اس نبو

۲۷- کتوبر ۱۹۰۸ء

جوراز تو بودہ است گرازا سمان نبو شادم کہ کار با صنمے نکنتہ وال نبو گو یا بہ سوئی مارہ این کاراں نبو ما بودہ ایم دیار و کسے دریاں نبو بال کہ درش گریہ ہنوزش وال نبو زاں شیدوہ ہائے خاص کی کہیاں نبو	ایں شیدوہ زین و سلسلہ بیرون نیرود صد حرف راز بود ہنار نگاہ من یک دہ نیم دوست نیاد و بوی دوست از شرم یا ز پیرس کہ در خلوت صال صد بار از سحاب گریہ بر چشم من در بزم عام نیز بہ بالطف و ابریت
در حیرت کہ پکی گفتار شش از کجاست شبلی گز مردم ہند و ستاں نبو	
۲۹- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
دیوانہ ہست عقل نہ شترش وں کنید ہم بدن باشد اردوسہ ماہی حسنوں کنید دجام بادہ گریہ میو ایند دخول کنید اول مرا بہ بادہ دے آرموں کنید اگر کوئی ہست چارچہ دو کوں کنید باری بسوی میکہ اش سمنوں کنید	خواہید اگر عیش و نشاط فزون کنید عمرے ہست این کہ عاقل و فزانہ یوں کنید دور از وصال دوست نشاطم حرام ب من نیز بچو شخ دم از زہدی زغم کار از برون گذشت میضای عشق زاہد بے دید و بہ جائی نہ بروراه
۵ دس رواں بودا سبق کا خوب یاد ہونا۔ ۱۲	۱۳ گردن پیشی سی ایما۔

سرتی میم تواند ز جاسے برد	مارا پشہ نگھے آزمون کیند
فرصت ز دست میرود ار و میرکث اگر گردن است چارہ شبلی کنون سید	
تیار خستہ علم الفت نیستواں	من خود به خیر تم چه گویم که چوں کیند
۲۹- کتوبر ۱۹۰۸ء	
اگر چه از دل طعم بود که شیدانه شود سوز غم هست گزندگی که افسون رود اگر عیان نگه بشوق به دستم بودے شاہد شوخ کسے را نہ شود در فرماں	ایک چوں شد نتوان گفت کہ رسوا نشود در عشق تست بلاے کہ ز سر و انشود سہل می بود کہ عشقم بہ تو پسید انشود و در مشود نیز بہ لطیف دیر دار انشود
شبلیا مصلحت آنست کہ سازی با چہر اگر چہ این زہر بہ کام تو گوارا نہ شود	
۳۰- کتوبر ۱۹۰۸ء	
درد و کی ز چہرہ من می شناختند لطفے نہ کوہ و گراں بار نیستیم از بسکہ خوش محاورہ اقا چشم داد	سوز عیان گشتہ عشق نبودہ را ما از تو بے حسیم متاع نبودہ را کہ و غم ہم از و سخن نماندہ را

اگر یا عزیز دوست دل نذر بوده را متوان روز و خواست متاع روزه را تا آرزو باز نماند آرموده را در نامه ام فرود گناه نه بود را	لطفش به عیش ز با نوده است و ش دل را ز غم باز گرفتن طبع را و قیل عاشقان چقدر خیره گشته است از بس گنه پسری من کاتب غل
	بستنی ز جیل بود که در شیوه های عشق ما آرموده ایم دل آرموده را
	۳۱- اکتوبر ۱۹۰۸ء
یاد آں روزی که من با خود چنان د شتم ماجرای با نگر بخت و دانه د شتم آشتی بائے نهان با پاسبان د شتم از غرور دلی که من به سم تان د شتم من که در آغوش خود جان چنان د شتم کز زمین کو چو افسانه د شتم هم به اوسته گفتم اردو و نهان د شتم از نگاه شوق با او داستان د شتم بعد د گفتم از راز نهان د شتم	یک مہر صد گونہ سوداے نمانے د شتم یاد آں روزی که در راز با جانی جیل یاد آں روزی که پنهان از خریفید گیل یاد آں روزی که دست افشان گد شتم از حرم خود تو دانی با جسم نام چاپه بود کار یہج باک از گردش گردون گردانم نہ بود یاد آں روزی که از نا کردہ کاری با خورش گرچه چمنی نے نیارتم بدو گستاخ گفت یاد آں روزی که من از سادہ لوحی با خود

	شبلیت آن جس لوہے پر لکھا ہے عجبی بود تا دہشتے کہ من خواب گر لے دہشتم	
	۳۱ - اکتوبر ۱۹۰۸ء	
کہ ہم از نام و ہم نشانِ خاست واں جفا جو بہ امتحانِ خاست زاہد از کوچہ معانِ خاست اگر دے از کوچہ پستانِ خاست صبر چارہ از میانِ خاست نگس از بارغ نا توانِ خاست	نہ ہمیں عاشق از جہاںِ خاست آسمانِ در کسینِ خاست پیر من جوئے از دئے کردند سرِ ہر چشم من آرید نغمِ اوبس کہ پائے کرد و راز در شوق تو جسد بخورند	
	شبلی خستہ دل مگر جہاںِ دا شورے از کوچہ فلاںِ پر خاست	
	۱ - نومبر ۱۹۰۸ء	
جو رے کہ کردہ ہست بطورِ خاست باما از ان ساخت کہ زدہ آشنا ہو دیدم کہ جے یک نگہ آشنا ہو	از لیکہ طفل بودہ و کار آشنا ہو دل را بہ اس سیربتلی و ہم کہا آن بزمنازل کہ نہ بیگانہ پر شدہ	

گو یاب باغ بندبستی تو دانه بود دین شکوه از تو بود ز باد صبا بود با ما که بودی سبز با آتشنا بود و آن جا به قدر یک صحنه نیز جان بود بے راه رفتن ز طریق خطا بود	هر گل متاع خویش بصد از منیر و محروم مانده ایم سبز از شبنم زلف تشکلف اگر دل ز هم بیکانه گشته است زاهد به وسعت جسم کعبه زداشت از بسکه جاوده با نعل غلط شاه راه
	و اعم که شبلی از می و نعلی نصیب ماند با آن که این عزیز مهمل ریا نبود
	۱- نومبر ۱۹۰۸ء
بوسه لعل شکرین باشد راه و رسم و فضا این باشد همچو نقشه که بر نگین باشد یار زود آتشنا چنین باشد آسمانم اگر کیس باشد شیوه و لبری همین باشد هر که عاشق بود خیزش باشد	آنچه خوشتر از انگیس باشد بد و حسرتی نه کرده یادوم بر لب و نشان بوسه بود می زخم اگر فضا نکشد دوست اگر مهر باں بود چه عمت دل نه هر کس که برد بازنه داد این عیب نیست گریزین شهم
شبلی آن دهن است این شهم	آید زنده بود و در کار اند

۳- نومبر ۱۹۰۸ء

بہوپال

تینش نہ حال خستہ دلاتا خبر گرفت
 پرستور و زندہ پرو دہم از شوق می زند
 ہر چند نامہ ہمہ یالست پارہ کرد
 ترسم کہ فتنہ دگر اندر جہاں فتنہ
 تخم امید باہر میں نامہ و غیر را
 عاشق نہ دیدہ ایم بدوئے کراں متا
 شیرینی بہ لذت و شہنام او نبود
 غافل بہ جواب باز تو خستی و بوسہ ام
 ز اہد ز را عشق بہ جہائے نمی رسید
 ابر بہا نامہ گوہر فشاں نہ بود
 خود یک شبانہ ماہ زاپس نہیدست
 لعل خنس کہ لب نتوان داشت بازو
 با آن لطافتی کہ شکر خندہ تو داشت
 و اعظا تو نیز گرچہ کہ گمراہ بودہ

بار سے کہ برتن با بود برگرفت
 آہ ایس چہ آتشہست کہ در شکافت
 یکبار می توان کف نامہ برگرفت
 کاں نو بہار باز رخ پر وہ برگرفت
 غفل ہوں شکر و فتنہ و فتنہ گرفت
 گستاخ و خیرہ آمد و تگش برگرفت
 گو یا ز نوش لعل لبش در شکر گرفت
 کام خود از دہاں لبان تو برگرفت
 معذ و باشد ارچہ کاہ گرفت
 گو یا کہ در سنس گر زنگان گرفت
 با آن شمع راہ فشاں گرفت
 روی چہاں کہ ز فتنہ او بد گرفت
 بار غم کہ بد دل با بود برگرفت
 گمہ تر از تو آن کہ ترا راہ برگرفت

آید بهار و روی زمین لاله زار گشت بر تخت گاه شاخ و خوسر گشت گل	یابود آتش که به بهر گوشه در گرفت فرغ آس نوای باریدی از گرفت
شبلی فسانه غم الفت تمام گفت مجنون تمام کرده او را ز سر گرفت	
۳- نومبر ۱۹۰۸ء	
در وصل نیز عاشق غمیده شاد نیست ایں نشئه هم ز حوصله زیاد نیست آں شیوه ها که خود گشت یابو نیست تاجی است ایں که دست یابو نیست ایں نیز شیوه رستم است او نیست تو خود فراموشی و مرا یس یاد نیست در درگاه عشق هنوزش سواد نیست طعم مزین که کفر تو هم اجتهاد نیست گویا ترا به غمزه خود هست او نیست هر چند در وفا پیش عثماد نیست	ایمن ز بازی فلک کج نهان نیست در یافتم سستی دوق وصال را هر خط چشم است تو بس یاد می کند فاز و دلی به بره هر کس نمی رسد ساز و بمن که بگذرم از دشمنی نمی رسد کنون چه گوئیت که بایں دلم چه بود مجنون که در گردن یس لاله غلط بود ایمان ما اگر چه به تقلید بوده است و قتل ما به تیغ سنان است چه حاجت است می داند اینقدر که رجای مستم در تیغ
ایں بس که آشای لفاق و عناد نیست	شبلی اگر نابل صفایست گو به اش

۴- نومبر ۱۹۰۰ء

دلبریں جو بوزند و جانگیر کینند خانِ صل چہ گیندِ ناخوش و کینند حرفِ نکارِ خواب، ہلہ زول نہ بود اینکہ گویند تاں مار کے تیر بود گاہ گاہے بہنِ خستہ بیدار اوقاتے کہ براحوال گداگیر کینند	ویں خزانہاں شاہک و فانی کینند ایں شکوں مار گرو بندہ قباگیر کینند اگر کہ ایں کار بہائین جیاگیر کینند باورم بہت شہر کیہ باگیر کینند اتفاقاتے کہ براحوال گداگیر کینند
---	--

شبلیا نابلد کو چہ مستقیم دے
دوستاں بہمت ایں شیوہ مایہ کینند

۵- نومبر ۱۹۰۰ء

پیرانہ سر جوئے می و جام کردہ ایم شامِ فراق را بہ بحرِ چوئی ایں ساند ماہر چہ گفتہ ایم بہ ناچار گفتہ ایم خواہیم ترک شاہد می و ز پرائی نیں زہر و زابا بہ امیدِ بہشت بود ایفا سے وعدہ ساز کہ ماہم و فاکیم	ما ابتداے کار ز خجماں کردہ ایم عمری گذشت تا سرے شام کردہ ایم ماہر چہ کردہ ایم بہ ناکام کردہ ایم از ناہم فسدہ دے و ام کردہ ایم ایں کار خستہ از طمعِ خام کردہ ایم آں وعدہ ہا کہ بادل ناکا کردہ ایم
--	---

	کارار جسد و جسد بود خوب تر بود	
	مانیز کار جو سه به ابرام کرده ایم	
	۲۳- اکتوبر ۱۹۰۸ء	
	ایں غمی انم کہ گبرم یا مسلمان نسیم آسمان طرئی نہ خواہد بیت سوائی پایہ کفر ایچہ چہ چوں نمی بنو دے لعل جان بخش تو ام گر چاہ فرمای کند گر چہ خود و انم کہ چنداں عاقل و دانا نسیم ہندوی لطفش چہ ادا من بھی چندین فرصتم باد کہ باستی درندی کو نم	انقدر د انم کہ ز اہنچہ ہست نسیم راں او و طسج من این از ان نسیم من این شادم کہ آخر ہم مسلمان نسیم من این دعوی بروں آیم کہ در ان نسیم باز ہم چوں نصح بے پایہ ناوان نسیم اند کے ہم کافر و خپراں مسلمان نسیم چوں رہ در ہم ریاد امر و میراں نسیم
	شاعری از من مجود و دراز سوار و مہدی حالی شبلی شہم رنہ غزل خوان نسیم	
۱۷ این غزل خلاف ترتیب نوشتہ شد، و ذلک لان المقطع کے ان یناسب الخاتمۃ ۱۲		

برگِ گل

برکاتِ گل

یعنی

قصائد و غزلہائے چند

از شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ

کہ

لختے از آہنا در آغاز شباب و لختے بیابان عمر گفتم

بجمع در ترتیب

مولوی معین الدین احمد قدوائی، ندوی، رئیس رولپور بارہنکی

مطبوعہ مطبعہ معارف عظیم گڑھ

نامہ را کہ گران مایہ ترا ز جان باشد	ما دین حرف کہ پیکے برسانید بہن
اچنین حرف دل آویزہ آساں باشد	نامہ وا کردم و بازش بپہر دم کہ بہن
کاین چنین حرف زد کجا زباندان باشد	نامہ را خواند و بفرمود کہ شک نیست دین
اعتبار گہرا ز منترخی کان باشد	کہ بودہ صاحب این نامہ وصلش نکاست
کز دکن ہست و مرا ہجو عزیزان باشد	گفتش رخیختہ خامہ ... ہست این
تا جہان باشد و تا گنبد گردان باشد	یارب آن دست و قلم در کفِ حفظ تو با

تشیب و غزل

این ملکِ حسنِ بلا خیز نہ بودہ است	تا نر گس تو عہدہ آگیز نہ بودہ است
شونو کہ بہ مایہ کم آیت نہ بودہ است	بنو و عجبے ار گرم در آسخت بہ اغیار
زین گو نہ حدیث تو دلاویز نہ بودہ است	واعظ! بگرت کار بہ لعل لبش اقتاد
بر عادت پیشینہ جنون خیز نہ بودہ است	داغم کہ بہارِ چمن "مبئی" امسال

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل و دین باخت
 این حرف و لے مصلحت آمیز نہ بودہ است

موج

نوبہ

اے گرم آئینِ من، اگر عجبی سے ملتا، اے کم آئینہ جو شخص لوگوں سے کم ملتا ہو۔

رفیقم دگر مستیم عیار کینسان بیکار تر از او نبود در ہر عالم با نالہ خوش افتاد مرا، ورنہ تو دانی نے نالہ مستانہ و نے گرمی آب ہے دانی کہ درین مکر کہ بانام و نشان کیت ہے فی ذوق نکاہے، و نہ ہنگامہ عشقے لے	حاشا کہ بہ تمیازہ ذوق نظر نیست آن دست کہ در حلقہ طوق مکر نیست کز نالہ و زاریم امید اثر نیست امروز بکویت مگر آشفہ سر نیست آن است کہ از نام و نشان اثر نیست اے واسے بشہرے کہ در وقت گری نیست در مملکت حسن مگر داد گرے نیست
۲۲ مئی	ستر بان دہان و لب آن شوخ کہ فرمود شبلی غلط است این کہ مرا با تو نمی جویت
من شب وصل بہ این جیلہ فریش دادم لذت لطف تلافی غمار شش بخند زاہدا، سچ کسے را نبود رہ بہرشت دل نہ آن چیز بود کہ تو توان داشت درینغ ہمنشین با تو درین مسلام نیست نزاع	لکین سحریت، فریغ رخ زیبای تو ہست آہ ازان دل کہ بآموذ جالای تو ہست حکم اگر حکم تو اورے اگر راسے تو ہست ویرا گرمی رود از ذوق تقاضاے تو ہست اینکہ گفتی کہ گناہ از دل شید اے تو ہست
لے یہ مصرع پورا نہیں،	

رفت دآن سوے عدم لرزد و محشر گردید جز تو کس را نبود در دل تنگم، را ہے از نظر رفتی و از شبده پردازی حسن اے کہ در قتل گہ از بندہ نشان می جوئی	قفسہ ہائے کہ نہ مان در قدر رخنائے تو ہست خانہ مختصری ہست و بہین جائے تو ہست ہم چنان در نظم جلوہ زیبائے تو ہست این نہ دیدی کہ سحر بہت کہ پرائے تو ہست	
۲۴ می	می ندانم کہ شکر ریزی شبلی بہ سخن ہست از دوا یا اثرے لعل شکر خائے تو ہست	۳۳
توبہ از بادہ نہ کار من تا کس باشد اے کہ گفتی بارہ در رسم تو نہ این می باید ہاں ابیا، تا کنم از بوسہ نشان برب تو از تو با بوسہ و آغوش تسلی نہ شوم لطف با قہر در آیم غمہ در کار راست عرشیان را بتوان گفت شب وصل نصن غیر از حرف بدی گفت بہ خرنندی من	این قدر ہم اگر عقل بود بس باشد ما ہمینیم کہ ہستیم و ہمین می باید شاہ مخنے و ترا نقش و نگین می باید شب وصل ست بہ سامان دین می باید خندہ برب و جینی بہ جبین می باید کاشم گوشہ از عرش برین می باید وین ندانست کہ بر شیوہ کین می باید	
۲۵ می	شبلیا کیست بہ کرد و ادب سخن می خواہی گر نظیری نبود، شیخ حزین می باید	۳۴

مرا که یک دل و صد گونه آینه‌ها هست دلم بناز کی لعل او سحر لرزد ز ناوک غلط انداز خود چه می‌ترسی حدیث خلد چو گویند با من مجنون ز سینه تا بزبانم پراست، و غمزه او به بخت جانی من کس مباد از عمری هزار حیف که در ملک حسن نتوان یافت بیا که ما تو هر جا برابر افتادیم جفا کنی و به این خیرگی نمی‌ترسی	شکب و صبر چو گویم که نیستم، یا هست که بوسه بے ادب عشق بے محابا هست بیا که بر لب من شکوای بجا هست گمان برم که مگر گوشه ز صحرای هست هنوز در ادب آموزی قفلها هست مدار زندگی و عده کافرا هست بجز متاع جفا که هست مهرها هست هر آن قدر که دفا با تو نیست، با ما هست که روز وادگر امر و زینت فدا هست
۱۹ بابل	هنوز نشه دوشینه در سرم باقی است که درس گویم و بخت ز جام صبا هست
چندے گره کتای غم زلفت بوده ام در کار عشق دیده در می شرط بوده است زلفش مودکان مشک فروشی کشاده است بیچاره دل میان دو قاتل فدا ده است	تا رفته رفته کار به بند قبار رسید هر کس نظر کشود و تماشا بسا رسید این خرده ام بگوش زبا و صبا رسید تا وک کشاد غمزه و تا زان قضا رسید

شوخے کہ از غرور بہ غور ہم نمی رسد	عذرش بنہ، اگر نتواند بار رسید
چھ ہزار گونہ سخن ساخت در پیام	بے چارہ گشت چون بہ سر مدعا رسید
غزل کہ در دوسہ ساعت گفتہ شد	
نگاہ ہے برین مسکین خدا را فغان کن بہر تاب و صبر و آرام نہ یاد آری گئے از شستہ خویش سخن را رہ نہ باشد در دہانت	کہ گاہ ہے شاہ نواز دگدرا را غمت نگذاشت در دل ہیچ جا فرماں ساختی حرف و فارا تیگی ہیچ در غیب صبارا
کجا در بار گاہش بار بخشد چو تسنیم غریب بے نوا را	
شد ہوا سے عرصہ گیتی بزرگ آتشین بسکہ از تقیدگی در ہیچ چیز غم نہاند	کہ نسیم صبح گرد شعلہ چون مرغ کباب شد حباب بحر همچون کوزہ ناویدہ آب
تانہ پنداری کہ حسرم میسر دیم از گداز شعلہ عنہم ہیچو شمع از نسیم یار گیسوے کے	از وطن با چشم پر غم میسر دیم بزم ہمارا کرد ہر دم میسر دیم زین جنان مانند آدم میسر دیم

لے اول تخلص تسنیم میکر د۔

خستہ پاس چسپند بردا مان گل	زین گلستان ہچو شبنم مے رویم
شبلیا از گردش گردون دون	دوستان رفتند ماہم مے رویم
لے غم عزیز دار وجودم کہ روز ہجر	صد آب برد از فرہ ماگریستن
کافی نشد و دیدہ سپے گریہ فراق	دارم چو ابراز ہمہ اعضا گریستن
شیر عین سخن درم بہر بیان	نادرہ روزگار شبلی نام آدم
لے گل باغ صباحت بوئے تو	سنبل تربستہ کیوئے تو
دیدہ براہم کے زندا ز فرط شوق	ہچو ز گس ہر کہ بندہ بوئے تو
چو بہ گلگشت چمن رفتی زنا ز	اے گل تر عورت رنگ بوئے تو
سرودر گلشن بہ یک پا ایناد	بہر تعظیم قدردجوئے تو
شبلی دل خستہ را دانی کہ کیست	ادسکے ہست از سگان کوئے تو

غزل دیگر

چند دور از رخ تو ہم نفس غم باشم با من از صحبت آن شوخ خوش افتاد است من به آن مایه نیر زم که به خلوت برسم بسکه لے بت به جہانے سرو کارت ترا مستی بادۂ الفت نہ بہ اندازہ بود من گداسے در میخانہ شدم از پئے آن این کمان را نتوانیم کہ تازہ بکشیم	چند چون زلف تو آشفته و در ہم باشم حاجتم نیست کہ مقبول دو عالم باشم بس بود این کہ بہ بزم آئی و من ہم باشم آن مبادا کہ من از را ز تو محرم باشم عجی نیست کہ رسوائے دو عالم باشم کہ گران منیچہ ام جام و ہر جم باشم شبلیا در فن شہر ارچہ سلم باشم
---	--

از بس بیا و آن متد ر عنا گریستم باسوز سینه ز اول شب تا دم صبح مار از چرخ چشم وفاے نبودہ است از سادگی بوعده و دنان منہ یستم	ببخود بزیر سایہ طوبے گریستم چون شمع در سراق تو شہا گریستم من برد فائے ست احبا گریستم الکون چہ سود گر ہمہ دریا گریستم
---	---

عجی بزرگ تر ز ہنر و زمانہ نیست

شبلی بجال مردم دانا گریستم

غزل آخرین

اشب این غلغلہ در کوچه و بازار افتاد کہ فلان می زد و بخود شد و سرشار افتاد
 سخن از صومعه و اہل و رع چند کنی کہ مرا کار بان چشم مستح خوار افتاد
 بسکہ غارت گر حسن تو جهان بر ہم زد یوسف از خانہ بدر جست بازار افتاد
 چہ عجب گر نگہ مست تو افستد بر من بادہ بیرون فتد از جام چو سرشار افتاد
 بشیوہ مهر زغبان نتوان داشت طمع کہ مرا کار بان طائفہ بسیار افتاد

مختب از پی و جمعی ز حریفان بہ کمین

(شہلیا) زندی پنهان تو دشوار افتاد

فقط

دیوان شبلی

دیوانِ شبلی

مُصَنَّف

عالمِ جناب و شمسُ العلماء مولانا شبلی نعمانی

سابق فیلو آف لیونی و رشی الہ آباد - پروفیسرِ مدرسۃ العلوم علی گڑھ
 باہم سررشتہ علوم و فنون سرکارِ ہندوستان

باہتمام محمد رحمت اللہ رتھ

در مطبع نامی کانپور طبع شد

تشبیب و غزل

غزل نامتتام

اندازه وفا نگرفت از جبین من	خوانا مگر نبود خطِ سر نوشت ما
از رد و هم قبول تو فارغ نشستم	ای آنکه خوب انشاسی از رشت ما
دیگر	
صحبت مگرت بود با خیار که امروز	ابر و سَ تو کی باره فروخت شکن را
عرض هزاره بود جدا گانه توان خواست	با عنسره میا لا نگه عریده فن را
دیگر	
بندۀ تازه - بهر دادرش بود همیش	صدره آن سربده جودا دین باز مرا
ایکه یک موی گنجد به میان من و تو	جلوه بناسی و ز من نیز پیرداز مرا
نه همین از مرده این رخشه بکارم افتاد	اجرا است بآن چشم فسون ساز مرا
دیگر	

بهرضوی هوشبخت همگانه نازنه به تاراج نگاهش رفت - حق دست باشد ز می این نایه سیهانی آید مگر شبلی	که من یک قد و بالا چیده ام ذوق تشارا ز کف سرار پایه بر تری هم آئین تقوی را همگانه است ساقی - برخت چیزی در قبح مارا
دیگر	دیگر
همین تنها نگاه و لطف را لذت شناس آتی	بپرس از تشنه گمان ستم ذوق عتابش را
دیگر	دیگر
چشم تو ز خواب ناز بر خاست بیستاب غم تو شعله آسا بنشست نیاز مند با غیر نه صرفه چه می توان نهفتن معمور به عشق ماند ویران	یا فتنه به ترک از بر خاست صد بار نشست باز بر خاست وز پهلوی من به ناز بر خاست چون پرده ز روی از بر خاست تا شبلی پاک از بر خاست
دیگر	دیگر
عمده برکت اینک از جنبش نگهداری این حسن را تا زم که هر موی ادای داشت خلد و خور و کوثر - ای دعا عطا اگر خوش کرده	ایک گفتی قصه سل - خطراتی بیش نیست ورنه زلف عنبرینش پیچ و تابش نیست بزم ما هم شاهد نقل و شرابی بیش نیست

داد-ازان هر کس که چشم چو پل اشک نیست	خنده اش گرفت گفت از دارا کی پیش نیست
	دیگر
افسانه بخوان زو که شکیم بیادش جز سجده ستایع دگر از کس پذیرفت خود پله بتوان بر دوز دار سنگی دل همت به نگا ہے کند و حوصله سنگر پارینه حدیثی است به تسلیم چه دارد خون ریختن دیده ام از دولت دل بود از مین خدنگ مژده تست که شبلی	فقطه اگر ای دل شبا هم سر دشت خالی که ز نقش قدم او اثر دشت کان ز گسستانه باین سر دشت کان نیز گئے با من گد باد گر دشت گویند که زین پیش فغان هم نشد دشت بیایه فتولی بیتلای دگر دشت تا بود در آغوش جگر شتر دشت
	دیگر
عشق پر بایه دگر عرض شهر میخواست در جهان هیچکس از عربه امین نه داشت بنفط هم بر شبلی نه نشستی کیبار	سخت دل باز آرایش مغان بخت تا بنگار گری آن ز گس فشان بخت گر چه بیچاره بشوای تو از جان بخت
	دیگر
ذوق را مرده که در محک جور دگر	نوبت داری از عمره پنهانی هست

نم آشی که آبتن طغانی هست کف خاکم بهوای سروامانی هست آتش افروخته هندی فسون جانی هست چون بدید آنکه هنوزم رقی جانی هست هند را نیز نمی هست و صفایانی هست	بگذرای ابرزد عوای که هنوزم بمرز وسعت حوصله سعی عمل بین که هنوز خال جا کرده بران عارض و شن گوی داشت دعوی میجائی و از من بگذشت روشم شد ز نوا سنجی شبلی کامروز
	دیگر
چاک با آنکه حبیبست بدان در ساخت ابدان تو که هیچ است عینون در ساخت هیچ دیدی که مجمل با گل و جان در ساخت	از وفا نیست در آئین جنون هم اثری دل که با هیچ نمی ساخت آزاده روی حاسد سفل و دون با تو سازد شبلی
	دیگر
اینقدر هست که بت خانه دلا دیر تر است گفته شبلی از ان نیز شکر دیر تر است	منکر خانه و صومعه نتوان بودن ای که از چاشنی لعل شکر خاکفتی
	دیگر
همچو ترکه که بنا که زمین خربسند شاد و شسته و درسم که خربسند	خمره از گوشه چشم تو بر آید میباید بر سر کوے تو نعمانی آشفته دزار

دیگر	
دارم از داغ تو در سینه گلستانی چند پروه برداشته اند از رخ تابانی چند همچنان باز بود و دیده حیرانی چند نغمه عشق سرودیم بدستانی چند سوخت برق گمشد خیم ایانی چند در قیامت من دست من و دمانی چند	بتماشاقتی در رنج بفرای که من حشر این گرمی هنگامه کجاست مگر ز انجمن رستی و چون دست ز گس بشل که فغان کردم و گه ناله و گاه فریاد زاهد این همه خافل چه نشینی که در خوب رویان چه جفت ادا که بر من کردند
دیگر	
هر طرف ناهای چین بچکد اشک خونین که بر زمین بچکد سجده بخواست از جبین بچکد همچو اشک که بر زمین بچکد	بر فغانی چو تره چپین بردماند ز خاک لاله و گل آستان که باشد این که مرا بشلی از چشمه یارافت اوم
دیگر	
بیهوده مرا عریده با چرخ حزن بود دیدم که خدنگ نکه آغشته بخون بود	حالم همه برهم زده قنقه چشمت است تا از جگر دسینه به پهلوی کنشت

	دیگر	
باغسمره بیباک ندانم چه توان کرد میخواهم ولیکن نتوانم چه توان کرد شبلی گمرا مرز نه آنم چه توان کرد		گیرم که آن نرگس جادو دهم دل دل را زخم زلف کسی - باز گرفتن زین پیش مرا نیز دلی بود و شکبه
	دیگر	
هستم خزان خوشتن هم به از خویش نخسته باش تا بکنم انتظار خویش از دوستیاری مژده اشکبار خویش		مانند لاله از جگر و اعدا خویش تو آمدی به بزم و من از خویش رفته ام بر پای دوست لعل و گهر کرده ام شمار
	دیگر	
من سرکنسم فیانه چو ماند زبان شمع		در شرح سوز و هجر شریک هم ما
	دیگر	
شبلی نگر که تا بچه عنوان فروختم نیمه دگر به غمزه پنهان فروختم		در جلوه گاه حسن دل پاره پاره را نیمه ازان به نرگس مستانه به ختم
	دیگر	
وربغات برو آن نرگس قنار چه کنم		خود گرفتم که بزلفش نفروشم دل دین

چاکے از دست جنون بہرہ من باشد و گر	ارمغانش نفسستم بگیر بیان چه کنم
دیگر	
چون نمود جبہ سرتو نالہ و گریہ کار من مرگ و حیات در فراق ہر دو بیایہ ہم اند جہنم را بی و دو کون دامن سعی بر زدند	کز دل و دیدہ ام یکی نیست باختیار من بر اثر خزان رو و دہے رخ تو بہار من ز گس فتنہ زای او گر دش رو ز کار من
دیگر	
دید می سحاب را کہ ز چشم گرد نہ برد	با آنکہ داشت از ہمہ اعضا گلیستن
دیگر	
نالہ من گر اثرے داشتے دلف تو کے صید خود میگرفت دست من از کار زنتے اگر	یار بانیز سر داشتے گر ز من آشفته ترے داشتے جائے بہ طوق کمرے داشتے
دیگر	
ہوش میگفت آن فتنہ گر ہوش را بی عمرہ در کار شد ای حوصلہ بان گرم بنہیز جای راحت نہ بود سینہ پر سوز ایدل	یکرہ از جلوہ بیارام کہ آیم جایی ناز ہنگامہ بیاراست تو ای صبر صبا آی و در سایہ مژگان ترم می آسای

تمام شد دیوان شبلی

